اُردو زبان کا اِرتقا

اِنسان کا شاید سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ زبان ہے۔ اس نے ہوا کی لہروں پر رقص کرنے والی آوازوں کو بامعنی بنایا اور کلمات کو خیالات اور اشیاء کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ لہٰذا اپنے اِس حیرت انگیز کرشمے پر انسان جتنا فخر کرے کم ہے۔ زبان ہمیں ایک دُوسرے کے تجربات اور احساسات سے آگاہ کرتی ہے اور ہمارے اعمال و حرکات کی راہیں متعیّن کرتی ہے۔ ہم دراصل زبان کے ذریعے اپنی ہستی کا اور اس رِشتے کا اقرار کرتے ہیں جو انسان نے کائنات اور دُوسرے انسانوں سے قائم کر رکھے ہیں۔ انسان کی ترقی کا راز بھی بہت کچھ زبان میں پوشیدہ ہے۔ کیونکہ عِلم کی قوّت کا سہارا زبان ہی ہے۔

بولنا اور بات چیت کرنا انفرادی عادت بھی ہے اور معاشرتی و آفاقی عادت بھی۔ اِنفرادی عادت سے مُراد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو بولنے کی عادت ڈالنی پڑتی ہے اور زبان سیکھنی پڑتی ہے خواہ وہ مادری زبان ہو یا کوئی اور زبان۔ گو مادری زبان ہم ماں کی گود ہی سے سیکھنے لگتے ہیں اور دُوسری زبانیں اُستادوں یا کتابوں کی مدد سے سیکھتے ہیں لیکن دونوں صُورتیں اِکتسابی ہیں وہبی نہیں ہیں۔ کیونکہ بات چیت کرنا زبان کا فطری عمل نہیں ہے۔ کوئی ہمیں آنکھوں سے دیکھنا یا کانوں سے سُننا نہیں سکھاتا۔ کیونکہ دیکھنا اور سُننا فطری عمل ہیں لیکن زبان کا معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ زبان فقط سیکھنے سے آتی ہے اور اگر نہ سیکھی جائے تو آدمی گونگا رہ جاتا ہے۔ پھر ہر شخص کی اپنی لِسانی اِنفرادیّت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر بولنے والے کا لہجہ دُوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور جُملوں کی بناوٹ اور لفظوں کا اِستعمال بھی جُدا جُدا ہوتا ہے۔ معاشرتی عادت کے معنی یہ ہیں کہ ہر زبان کسی مخصُوص معاشرے کی اِجتماعی زبان ہوتی ہے نہ کہ کسی ایک فرد کی۔ معاشرے سے باہر اس زبان کا وجُود نہیں ہوتا اور نہ زبان کو اپنے معاشرے سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ہر فرد اپنے معاشرے کی زبان کو اپناتا اور اختیار کرتا ہے۔ آفاقی عادت سے مُراد یہ ہے کہ کرۂ ارض پر کوئی ایسی قوم، قبیلہ یا انسانی گروہ موجُود نہیں جس کی اپنی زبان نہ ہو۔

زبانیں سماجی ضرورتوں کے باعث وجُود میں آئیں۔ جب تک کوئی زبان ان ضرورتوں کو پُورا کرتی ہے یا سماجی حقیقتوں اور قدروں کا ساتھ دیتی ہے وہ زندہ رہتی ہے۔ جب اس میں یہ صلاحیّت باقی نہیں رہتی تو وہ مرجاتی ہے جیسے سنسکرت یا لاطینی کہ اب بول چال کی زبانیں نہیں رہیں۔

زبانوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں صُوری بھی ہوتی ہیں اور معنوی بھی۔ معاشرہ جُوں جُوں ترقی کرتا یا بدلتا ہے، اُس کی زبان میں بھی نئے نئے الفاظ اور محاورے داخل ہوتے جاتے ہیں اور فرسُودہ الفاظ اور محاورے متروک ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اضافے اور ترامیم سماجی تقاضوں یا یُوں سمجھیے کہ سماجی سہُولتوں کے پیشِ نظر ہوتی ہیں۔ مگر ہوتی ہیں بالکل غیر اِرادی یا نادانستہ طور پر۔ لوگوں کو محسُوس بھی نہیں ہوتا لیکن سو دو سو سال کے اندر زبان میں آہستہ آہستہ بہت نمایاں فرق آجاتا ہے۔

زبان کا تعلّق فقط رواج سے ہے۔ نسل، رنگ، مذہب یا جُغرافیائی محلِّ وقُوع کی وجہ سے لوگوں کی زبانیں نہیں بدلتیں۔ ہر شخص خواہ اس کا تعلّق کسی مُلک، قوم یا مذہب سے ہو، جو زبان چاہے سیکھ اور بول سکتا ہے۔ کیونکہ صوتی اعضا سب اِنسانوں کے یکساں ہیں۔ اگر پاکستان کے لوگ خالص عربی آوازیں ـــــ ع، ص، ث، ط، ظ وغیرہ ـــــ نکالنے سے قاصر ہیں یا عرب قوم کے لوگ پ، ڑ یا ٹ کی آوازیں نہیں نکال سکتے تو اِس کی وجہ صرف رواج ہے۔ کسی لِسانی علاقے کے بچّے کو اگر کم سِنی میں دُوسرے لِسانی علاقے میں منتقل کر دیا جائے تو وہ اس نئے علاقے کی تمام لِسانی آوازوں کو مقامی باشندوں کی طرح ادا کرنے لگے گا۔

دانش ور حضرات ہزاروں سال سے زبان کے مسائل پر غور و فکر کر رہے ہیں۔ زبان کب اور کیسے وجُود میں آئی۔ مُنہ سے نکلی ہُوئی آوازوں میں معنی کیسے پیدا ہُوئے۔ الفاظ اور اشیاء کا رِشتہ کیا ہے۔ خیال اور الفاظ میں کیا تعلّق ہے۔ کیا زبان کے بغیر شعُور ممکن ہے۔ پہلے کلمہ بنا یا جُملہ۔ سب سے قدیم زبان کون ہے۔ کیا زبان ہمارے خیالات اور جذبات کو ادا کرنے کی پُوری قُدرت رکھتی ہے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا تشفّی بخش جواب ابھی تک نہیں ملا ہے۔ لِسانیات کے ان مسائل کے بارے میں افلاطون کے وقت سے اب تک مختلف نظریات پیش کیے جاچُکے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ زبان تخلیقِ خُداوندی ہے (انجیل)۔ کسی کی رائے ہے کہ انسان نے جانوروں کی آوازوں کی تقلید کی ہے (افلاطون اور ہرڈر)۔ کسی کا خیال ہے کہ انسان میں گویائی کی قوّت فطری طور پر موجُود ہے اور اُس نے قدرتی آوازوں کی نقل کی ہے (میکس مُلر)۔ کوئی دعوٰی کرتا ہے کہ پُرانی زبانوں کے اِبتدائی مادّے انسان کے حرکات و سکنات کی نمائندگی کرتے ہیں (گیگر)۔ اور کسی کا نظریہ ہے کہ شدّتِ جذبات کے موقع پر جو آوازیں انسان کے مُنھ سے بے اختیار نکلیں اُنھوں نے رفتہ رفتہ زبان کی شکل اِختیار کرلی۔ البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ زبان کسی ایک فردِ واحد کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ایک معاشرتی عمل ہے جس کا ظہور لاکھوں برس گذرنے پر آہستہ آہستہ ہُوا۔ جس طرح کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ انسان نے دماغ سے سوچنا اور ہاتھوں سے کام لینا کب شرُوع کیا، اُسی طرح یہ بھی نہیں بتایا جاسکتا کہ اِنسان نے بولنا کب شروع کیا اور بات چیت کی طرح کب ڈالی۔ چنانچہ عربی ہو یا فارسی، چینی ہو یا سنسکرت کسی قدیم زبان کے بارے میں وثُوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب وجُود میں آئی۔

لیکن اُردو زبان کا معاملہ قدرے مختلف ہے کیونکہ اُردو قدیم زبان نہیں ہے۔ اس کی عمر مُشکل سے سات آٹھ سو سال ہوگی۔ یہ زبان ہندی کی شائستہ اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس نے فارسی، عربی، ترکی اور انگریزی کے میل سے رفتہ رفتہ موجُودہ صُورت اختیار کی ہے لیکن جدید ہونے کے باوجود اُردو کا سنِ ولادت متعیّن نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ زبانوں میں تبدیلی اور ترقی بہت دھیرے دھیرے اور بڑے غیر محسُوس طور پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُردو کے فقط عہد بہ عہد ارتقا کی نوعیّت بیان کرسکتے ہیں اور اُن ادوار کی نشان دہی کرسکتے ہیں جن سے یہ زبان گذری ہے۔ اس کی پیدائش کا وقت اور مقام بتانے سے قاصر ہیں۔

خصوصیت اُردو زبان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندی، فارسی اور عربی کی تمام آوازیں موجود ہیں۔ اُردو کے حروفِ ہجا ان تینوں زبانوں کے حروفِ ہجا سے مل کر بنے ہیں۔ دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس کے افعال اور ضمائر، حروفِ تمیز (اب، جب، یہاں، وہاں) حروفِ نسبت اور ربط (کے، نے، سے، تک)، حروفِ عطف (اور، نہ) حروفِ تخصیص (ہی، بھی، تو) حروفِ فجائیہ (اے، او، ارے) اور گنتی کے اعداد سب ہندی ہیں۔ مصادر بنانے کا طریقہ اور مصدر کی علامت ہندی ہے (نا) خواہ اصل لفظ عربی ہو (دفن سے دفنانا) یا فارسی (بخش سے بخشنا) یا ہندی (ٹھوکر سے ٹھکرانا) اسی طرح جملوں کی بناوٹ اور بناوٹ کے ڈھنگ بھی ہندی ہیں۔ اور سابقے اور لاحقے اور مرکبات بنانے کا اُصول بھی آریائی ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اس زبان میں دُوسری زبانوں کے لفظوں اور محاوروں کو اپنانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ یہ الفاظ کبھی اپنی اصلی شکل میں شامل کر لیے جاتے ہیں اور کبھی ان کی شکل یا معنی میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اُردو میں فارسی اور عربی کے الفاظ بالخصوص اسما بڑی کثرت سے داخل ہوئے ہیں۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اُردو کا رسم الخط ابتدا سے فارسی ہے۔

نام اُردو زبان کو اُنیسویں صدی کی ابتدا تک ہندی، ہندوی، دہلوی، ریختہ، ہندوستانی، دکنی اور گجراتی غرض مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا جس وقت مسلمانوں نے اس مُلک میں قدم رکھا تو یہاں ہندی نام کی کوئی زبان یا بولی نہیں تھی۔ امیر خسرو (۱۲۵۳-۱۳۲۵ء) نے نُہ سپہر میں ہندوستان کی زبانوں کے نام گِنوائے ہیں مگر وہ بھی ہندی کا ذکر نہیں کرتے۔ (۱۔ سندھی ۲۔ لاہوری ۳۔ کشمیری ۴۔ ڈوگری ۵۔ دھورسمندری (ملیالم) ۶۔ تلنگی ۷۔ گجراتی ۸۔ معبری ۹۔ گوڑی ۱۰۔ بنگالی ۱۱۔ اودھی ۱۲۔ دہلوی ۱۳۔ سنسکرت) ہندی کا لفظ مُسلمانوں کی ایجاد ہے۔ وہ ہندستان کی ہر زبان کو ہندی کہتے تھے۔ حتیٰ کہ عربی کی قدیم کتابوں میں سنسکرت کو بھی ہندی کا لقب دیا گیا ہے (خطبات عبدالحق صفحہ ۳۴)۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے اس ملی جُلی زبان کو بھی جو اُن کی آمد سے وجود میں آئی ہندی کا نام دیا۔ یہ ابہام مُدت تک باقی رہا۔ اور مُسلمان ہندی کا لفظ دونوں معنی میں استعمال کرتے رہے۔ مثلاً مولوی محمد مُسلم "گلزارِ آدم" (۱۲۵۰ھ) میں لکھتے ہیں ؎

اِک دن دِل وِچ گذریا میرے راہ خیال
ہندی وِچ پیغمبراں دا کجھ آکھاں میں حال

حالانکہ یہ اشعار پنجابی زبان میں ہیں۔

یہ ملی جُلی زبان تھوڑے تھوڑے فرق سے پنجاب، دہلی، یُو۔پی، مالوہ اور بہار غرض پُورے شمالی ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ امیر خسرو بار بار اسے ہندی اور ہندوی کہتے ہیں۔ یہ وہی زبان ہے جس میں اُنھوں نے شعر کہے۔ چنانچہ وہ اپنے فارسی کے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "جزوی چند نظم ہندی نیز نذر کردہ شدہ است ہم بذکری بندہ کردم"۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ ؎

تُرک ہندستانیم من ہندوی گویم جواب
شکّرِ مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن

ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎ زبن ہندوی پُرس تا نغز گویم

شاہ میراں جی شمس العشاق دکنی (متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) نے اپنی تصنیف خوش نغز کو ہندی زبان کا رسالہ لکھا ہے۔ میر تقی میر، میر حسن دہلوی اور مصحفی نے اپنے تذکروں میں اُردو شاعروں کے حالات بیان کیے ہیں مگر اُن کو "سخن آفرینانِ ہندی" اور "سخن گویانِ ہندی" کا لقب دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلوی (متوفی ۱۸۱۴ء) اور شاہ رفیع الدین دہلوی (متوفی ۱۸۱۷ء) نے قرآن شریف کا ترجمہ جس زبان میں کیا ہے۔ اُسے "زبان ہندی" سے تعبیر کیا ہے۔

دکن میں اس زبان کو دکنی کے علاوہ ہندی بھی کہتے تھے۔ چنانچہ دکنی شاعر آگاہ (متوفی ۱۸۰۵ء) رسالہ "فرقہ ہائے اسلام" میں لکھتا ہے ؎

دلے بعض یاروں کا ایما ہُوا
سو ہندی زباں یہ رسالہ ہُوا

میر اثر دہلوی اپنی مثنوی خواب و خیال میں جو ۱۷۴۰ء میں تصنیف ہُوئی لکھتے ہیں ؎

فارسی سَو ہیں، ہندوی سَو ہیں
باقی اشعار مثنوی سَو ہیں

اس سے تقریباً پونے دو سو برس پیشتر میراں یعقوب اپنے رسالہ شمائل الاتقیا (مصنفہ ۱۰۷۸ھ/۱۶۶۷ء) میں لکھتے ہیں .... "جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کس کے تئیں سمجھا جاوے"۔ شیخ باجن گجراتی (متوفی ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء) اس زبان کو دہلوی کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ "صفت دُنیا بہ زبانِ دہلوی گفتہ" اور اس سُرخی کے تحت جو اشعار دیئے ہیں وہ اُردو شاعری کا ابتدائی نمونہ ہیں۔

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں کہ "یہی زبان جب جنوب کی طرف گئی تو اُس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ دکن میں پہنچی تو دکنی لہجے اور الفاظ کے داخل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات میں گئی تو وہاں کی مقامی خصوصیات کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی"۔

گولکنڈہ کے قطب شاہی عہد کا شاعر وجہی (۱۱ ویں صدی ہجری) مثنوی قطب و مشتری میں لکھتا ہے ؎

دکھن میں جوں دکھنی مِٹھی بات کا
ادا نئیں کیا کوئی اس دھات کا

اسی عہد کا ایک اور مشہور شاعر ابن نشاطی مثنوی پھُول بن میں لکھتا ہے ؎

اسے ہر کس کتیں سمجھا کوں توں بول
دکھنی کے باتاں ساریاں کوں کھول

بیجاپُوری شاعر نصرتی (متوفی ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) مثنوی گلشنِ عشق میں لکھتا ہے ؎

صفائی کی صُورت کی ہے آرسی
دکھنی کا کیا شعر ہوّل فارسی

ہے دکھنی میں مجھ کوں مہارت یتی
کہ اَلتّصرو تکو کہے نصرتی

اور کمال خاں رستمی اپنی مثنوی خاور نامہ (مصنفہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء) میں لکھتا ہے ؎

کیا ترجمہ دکھنی ہُوا دلپذیر
بولیا معجزہ کمال خاں دبیر

یہی زبان گجرات میں گجراتی یا گجری کہلائی۔ چنانچہ شیخ محمد خوب مثنوی خوب ترنگ (مصنفہ ۹۸۷ھ/۱۵۷۹ء) میں اسے گجراتی کہتے ہیں ؎

جیوں دل عرب عجم کی بات — سُن بولی، بولی گجرات

اور شاہ علی محمد کی "جواہر اسرار اللہ" کو اس کا مرتب کرنے والا شیخ حبیب اللہ قریشی، گوجری کہتا ہے "در بیانِ توحید و اسرار بالفاظِ گوجری بطریقِ نظم فرمودہ میں نظم آوردہ و جمع کردہ۔"

اسی زبان کو وجہی نے اپنی کتاب "سب رس" (۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء) میں "زبانِ ہندستان" لکھا ہے۔ "آغاز داستان زبانِ ہندستان، نقل ایک شہر تھا" جب بنگال بہار اور گنگا جمنا کے دوآبے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دخل ہوا تو "صاحبانِ عالی شان" کو دیسی زبانیں سیکھانے کی ضرورت پڑی۔ اس وقت ملک کی سب سے مقبول زبان جو شمالی ہند کے علاوہ دکن حتیٰ کہ مدراس اور بنگال میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، ہندی تھی۔ اس لیے کمپنی نے اس کی تعلیم پر خاص توجہ دی۔ مگر ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس پریشانی کو دور کرنے کی خاطر جو ہندی کے ذو معنی ہونے سے پیدا ہوتی تھی ہندی کو ۱۷۸۷ء میں ہندستانی کا نام دیا۔ (تاریخ ادب اُردو از رام بابو سکسینہ) ڈاکٹر گل کرسٹ اپنی کتاب "مشرقی زبان داں" (اورینٹل لنگوئسٹ مطبوعہ ۱۷۹۹ء کلکتہ) میں ہندستانی کی اصطلاح چننے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اِس ملک کی مقبول عام بولی ہندوی ہے۔ یہ زبان مسلمانوں کے حملے سے پیشتر بھی یہاں رائج تھی۔ مسلمانوں کے آنے کے بعد اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بہ کثرت شامل ہوگئے مگر زبان بدستور ہندی رہی۔ البتہ دو جدا جدا اسٹائل پیدا ہوئے۔ ہندو قدرتی طور پر زیادہ تر ہندوی کی طرف جھکے گا اور مسلمان بلاشبہ عربی اور فارسی کی طرف۔ اِس وجہ سے دو سٹائل پیدا ہوتے ہیں۔ یعنی درباری یا اعلیٰ سٹائل (COURT OR HIGH STYLE) منطقی اور پُر تکلف اور ملکی یا قدیم سٹائل۔ ان دونوں کے درمیان ایک مروجہ سٹائل بھی ہے اور میں نے اسی کی سفارش کی ہے کیونکہ یہ مفید ہے۔" اس سٹائل کو وہ ہندستانی کا نام دیتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ "ہمیں اس مقبول عام بولی کے دوسرے تمام نام مسترد کر دینے چاہئیں (ان میں وہ مہمل لفظ مُورس بھی شامل ہے) اور ان کی جگہ ہندستانی کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیئے۔ اس میں فارسی اور عربی کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ ان آخری دو زبانوں کا رشتہ ہندستانی سے وہی ہے جو انگریزی زبان سے لاطینی اور فرانسیسی کا ہے۔ اور ہندوی کا نئی بولی یعنی ہندستانی سے وہی رشتہ ہے جو سیکسن کا انگریزی سے ہے (یعنی ہندستانی کی بنیاد ہندوی ہے اور اس کا بالائی ڈھانچہ فارسی اور عربی ہے۔ س۔ ح) اس کو ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں:

سیکسن	لاطینی	فرانسیسی	انگریزی
ہندوی	عربی	فارسی	ہندستانی

اس تشریح سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندستانی سے ڈاکٹر گل کرسٹ کی مراد اصل اُردو زبان تھی۔ ہندستانی زبان کا جو نمونہ مسٹر ڈبلو۔ بی۔ بیلی نے پیش کیا ہے اس کے بعد تو غلط فہمی کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی۔ مسٹر بیلی نے جو کچھ دنوں کے لیے گورنر جنرل بھی ہو گئے تھے ۱۸۰۲ء میں ہندستانی زبان پر ہندستانی ہی میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اِس مضمون میں وہ لکھتے ہیں کہ "ہندستانی زبان جس کا ذکر میرے دعویٰ میں ہے اس کو ہندی، اُردو اور ریختہ بھی کہتے ہیں۔ اور یہ مرکب عربی، فارسی اور سنسکرت یا بھاشا سے ہے اور یہ پچھلے اگلے زمانے میں تمام ہند میں رائج تھی۔ عرب سوداگروں کی آمد و رفت اور مسلمانوں کی یورش اور حکومت قیامی کے باعث عربی اور فارسی الفاظ اسی پرانی بولی میں بہت رل گئے اور ایک نئی زبان بن گئی جیسے کہ بنیاد قدیم پر تعمیر نوی ہوئے۔ آخر الامر یہ بولی ہندوستان میں سب کو عزیز اور پیاری ہوئی اور اکثر متوطنوں نے اسی مرکب زبان پر راغب ہو کر اس کو اخذ کیا کہ اپنے ایسے معاملات جن کا استحکام موقوف تحریر پر نہ ہو ان میں اسی سے کلام کریں۔" (بحوالہ خطبات عبدالحق ص۱۶۰)

ریختہ کا لفظ اس وقت استعمال ہوا جب اُردو میں ادبی شان پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن یہ لفظ زیادہ تر شعر و سخن اور ادبی کلام کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور فارسی سے امتیاز کرنے کے لیے لکھا اور بولا جاتا تھا۔ چنانچہ جن مشاعروں میں فقط اُردو شاعروں کا کلام پڑھا جاتا تھا۔ انھیں مراختہ کہتے تھے۔ یہ اصطلاح بہت دن نہیں رہی۔ اُردو کی اصطلاح عام ہوئی تو یہ لفظ خود بخود متروک ہو گیا۔

اُردو ترکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی لشکر، سپاہی، کیمپ، خیمہ وغیرہ کے ہیں۔ عہدِ مغلیہ میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن زبان کے معنی میں اس لفظ کا استعمال چنداں قدیم نہیں۔ میر امن دہلوی، سر سید احمد خاں اور سید احمد دہلوی مؤلف فرہنگ آصفیہ کا یہ دعویٰ کہ اُردو زبان کی ابتدا شاہجہانی لشکر (اُردو) سے ہوئی اِس لیے اِس زبان کا نام بھی اُردو پڑ گیا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اٹھارویں صدی عیسوی سے پیشتر کا کوئی شاعر، ادیب اور تذکرہ نگار اس زبان کو اُردو سے تعبیر نہیں کرتا۔ سراج الدین خاں آرزو نے شاید سب سے پہلے ۱۷۵۱ء میں اُردو کا لفظ زبان کے معنی میں استعمال کیا۔ میر محمد عطا حسین تحسین نے بھی اس لفظ کا اطلاق زبان پر کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تصنیف "نوطرزِ مرصع" (۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء) میں لکھتے ہیں: "اور یہ جو کوئی چاہے سیکھنے زبان اُردوئے معلی کا رکھے گا سو مطالعہ اس گلدستہ نگاریں ......"

مگر زبان کا یہ نام غالباً اس وقت تک عام ہو چکا تھا کیونکہ میر امن دہلوی "باغ و بہار" (مصنفہ ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء) میں لکھتے ہیں: "حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں سے یوں سُنی ہے ....."

یہ جملہ وہ کلکتہ میں لکھ رہے ہیں حالانکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور فورٹ ولیم کالج کے حکام اِس زبان کو ہندستانی کہتے تھے۔

میر امن کی مانند سید انشاء اللہ خاں انشا نے بھی دریائے لطافت میں (۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء) اور قدرت نے اپنے تذکرہ میں اور مولوی اکرام علی نے اخوان الصفا (۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) میں اس زبان کو اُردو ہی لکھا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ لفظ دوسرے سب لفظوں — ہندی، ہندوی، ہندستانی وغیرہ — پر سبقت لے گیا اور آج ہر جگہ اس زبان کو اُردو ہی کہتے ہیں۔

اُردو زبان کا خاندان

عُلمائے لسانیات نے زبانوں کو اُن کی صوتی اور صرفی خصوصیات کی بنیاد پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے بڑا خاندان آریائی زبانوں کا ہے۔ اُس کے بعد منگول خاندان (چینی، جاپانی وغیرہ) کا نمبر آتا ہے۔ اور پھر سامی (عربی اور عبرانی وغیرہ) اور دراوڑی (تلگو، تامل، ملیالم، کنڑی) زبانوں کے خاندان ہیں۔ آریائی خاندان جو بنگال سے ناروے تک پھیلا ہوا ہے کئی گھرانوں میں بٹ گیا ہے۔ ۱۔ تیوتانی گھرانا جس میں جرمن، انگریزی، ڈچ، فلیمش اور سکنڈی نیویا کی زبانیں شامل ہیں۔ ۲۔ لاطینی گھرانا جس میں اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں شامل ہیں۔ ۳۔ یونانی۔ ۴۔ سلاوی گھرانا جس میں رُوسی، پولش، چیک اور بلغاری زبانیں شامل ہیں۔ ۵۔ ہند ایرانی گھرانا جس میں سنسکرت،

فارسی، ہندی، پنجابی، پشتو، سندھی، گجراتی، مرہٹی اور بنگالی زبانیں شامل ہیں۔

ہمیں نہیں معلوم کہ آریوں کی ابتدائی زبان کیا تھی۔ البتہ اب سے چار پانچ ہزار برس پہلے جب اُن کے قبیلوں نے غذا کی تلاش میں آبائی وطن ترک کر کے دُور دراز علاقوں کا سفر اختیار کیا تو ان کی زبانوں میں فرق پیدا ہو چکا تھا۔ جب ایک قبیلہ دُوسرے قبیلے سے الگ ہو کر نئے ماحول میں آباد ہُوا تو یہ فرق اور بڑھتا گیا۔ آریا لوگ برِصغیر پاک و ہند میں شمال مغربی اور جنوب مغربی سرحدوں کو پار کر کے داخل ہُوئے۔ وہ سب کے سب ایک ساتھ یا ایک ہی وقت میں نہیں آئے بلکہ الگ الگ گروہوں میں آئے اور یہ سلسلہ کئی ہزار سال تک جاری رہا۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان سب قافلوں کی زبان سنسکرت تھی بلکہ بعض عُلمائے لسانیات کا تو خیال ہے کہ سنسکرت اس برِصغیر میں بول چال کی زبان کبھی نہ تھی۔ اور آریاؤں کی زبان شورسینی اور مگدھی سے ملتی جُلتی تھی۔ آریا قبیلے جس وقت وادیٔ سندھ میں داخل ہُوئے تو یہاں کی قدیم تہذیب بہت عرُوج پر تھی۔ ہڑپا اور موئن جو دڑو اس تہذیب کے اہم مرکز تھے۔ آریوں نے کہ زیادہ طاقت ور اور آلاتِ جنگ سے مُسلح تھے، وادیٔ سندھ پر قبضہ کر لیا اور یہاں کی تہذیب کو تاخت و تاراج کر کے اپنی تہذیب کا سکہ جمایا۔ قتل و غارت گری کے بعد جو مقامی باشندے بچ رہے تھے وہ دکن کی طرف بھاگ گئے یا آریوں کے غلام بن گئے۔ البتہ فاتح تہذیب مفتُوحین کی تہذیب سے اثر لیے بغیر نہ رہ سکی۔ آریوں نے یہاں کے دیوی دیوتا اور رسم و رواج بھی اپنا لیے اور یہاں کی پراکرتوں سے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اور وادیٔ سندھ کے الفاظ، آوازیں اور محاورے اپنی زبان میں شامل کر لیے۔

آریوں نے رفتہ رفتہ وادیٔ سندھ اور گنگا جمنا کے دوآبے پر قبضہ کر لیا اور پُورے شمالی ہندستان میں پھیل گئے۔ مگر وہ جہاں بھی گئے مقامی پراکرتوں کے اثر سے بچ نہ سکے کیونکہ تہذیب کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا بلکہ اُس کا عمل دو رُخا ہوتا ہے۔ آریا قبیلے جُوں جُوں مقامی پراکرتوں کا اثر قبُول کرتے گئے وہ اپنی آبائی زبان سے اَور دُور ہوتے گئے۔ نئے ماحول میں رہنے سے اور ایک دُوسرے سے دُور ہو جانے کے باعث ان کی زبانوں میں فرق بڑھتا گیا۔ جو قبیلے قریب قریب آباد ہُوئے ان کی زبانوں میں تو زیادہ فرق نہیں ہُوا لیکن جن قبیلوں میں فاصلے کے سبب سے مِلنا جُلنا نہیں رہا اُن کی زبانیں ایک دُوسرے سے اتنی مختلف ہو گئیں کہ کچھ عرصے بعد یہ پہچاننا بھی مُشکل ہو گیا کہ آیا یہ زبانیں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں یا نہیں جیسے سندھی اور بنگالی۔

برِصغیر پاک و ہند کی مختلف آریائی بولیوں کی باقاعدہ تشکیل کا زمانہ ۶۰۰ ق۔م سے ۱۰۰۰ء تک ہے۔ انھیں پراکرت یعنی قُدرتی یا عام بول چال کی زبان بھی کہتے ہیں۔ اِس عہد کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دَور ۶۰۰ ق۔م سے ۱ء تک کا ہے۔ اِس میں پالی زبان کو فروغ ہُوا جو بُدھ مت کی زبان تھی۔ دوسرے دَور میں (۱ء — ۵۰۰ء) مہاراشٹری، شورسینی، مگدھی (جنوبی بہار) اور پیشاچی (کشمیری) زبانوں نے ترقی کی۔ شورسینی گنگا اور جمنا کے دوآبے کی زبان تھی۔ اِس عہد کے سنسکرت ڈراموں میں عورتیں عام طور سے اِسی زبان میں بات چیت کرتی تھیں (اُردو زبان کا ارتقا از ڈاکٹر شوکت سبزواری صہ۳۱) البتہ ان ڈراموں کے گانے مہاراشٹری میں ہوتے تھے اور نچلے طبقے کے افراد مگدھی میں بات چیت کرتے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ تقسیم ہے اس سے اِن پراکرتوں کی سماجی حیثیت اور اہمیت کا اور سنسکرت سے ان کے تعلقات کا پتا چلتا ہے۔

تیسرا دَور اَپ بھرنش زبانوں کے فروغ کا ہے (۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک) اُپ بھرنش کے معنی ہیں بگڑا ہُوا۔ اِس دَور میں پراکرتوں کے دو رُوپ ہو گئے۔ ایک عام بول چال کی زبان جو دیہات اور میلوں بازاروں میں بولی جاتی تھی۔ یہ اُپ بھرنش کہلائی۔ دُوسرے علمی اور ادبی زبان جو شہروں میں تصنیف و تالیف کی زبان تھی۔

برِصغیر پاک و ہند کی اُپ بھرنشوں کا عہدِ جدید گیارھویں صدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دَور میں بولیوں نے آہستہ آہستہ مُستقل زبانوں کی شکل اختیار کر لی۔ اِن زبانوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ پیشاچی یعنی کشمیری، پشتو اور شمال مغرب کی پہاڑی بولیاں

۲۔ شورسینی (یعنی ہندی)، راجستھانی، پنجابی، سندھی، گجراتی اور مرہٹی

۳۔ مگدھی یعنی بنگالی، بہاری، آسامی اور اُڑیہ

ہندی کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ یہ زبان مُلتان سے پٹنے تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس کی بہت سی مقامی بولیاں تھیں مثلاً برج بھاشا، کھڑی بولی، اودھی، بھوج پوری، قنوجی، ہریانی وغیرہ۔ اور یہ زبان راجستھانی اور پنجابی سے بہت قریب تھی۔ مُماثلت اور ہمسائگی کے باعث ہم ہندی (مغربی اور مشرقی)، پنجابی، راجستھانی اور سندھی وغیرہ کو آپس میں بہنیں کہہ سکتے ہیں۔

اس برِصغیر کے تعلّقات ایران سے کئی ہزار برس پُرانے ہیں۔ ہماری طرح ایران کے لوگ بھی آرین ہیں اور ان کی زبان (فارسی) کو عُلمائے لسانیات سنسکرت کی سگی بہن کہتے ہیں۔ ان کے سیاسی اور تجارتی تعلّقات بھی بہت قدیم ہیں۔ جب ہستاسپ کے بیٹے داریوش (۴۸۵ - ۵۲۱ ق۔م) نے وادیٔ سندھ کے پُورے علاقے کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو یہاں ایرانی تہذیب کی چھاپ اور گہری ہو گئی۔ صدیوں تک یہ علاقہ ایرانی سلطنت کا ایک صُوبہ رہا۔ چنانچہ خروشتی رسمُ الخط جو آرامی رسمُ الخط سے ماخُوذ ہے اور جس پر ناگری لپی کی بُنیاد ہے ایرانیوں ہی نے اس برِصغیر میں رائج کیا تھا۔ یہ رسمُ الخط ہمارے ملک میں چوتھی صدی عیسوی تک استعمال ہوتا رہا۔ (آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا صہ۴۳ مطبُوعہ ۱۹۶۱ء) اس لیے برِصغیر کی زبانوں بالخصوص پنجابی، پشتو اور ہندی میں مُسلمانوں کی آمد سے پیشتر فارسی الفاظ کا پایا جانا اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

ہمارے ملک میں عربوں کی آمد و رفت بھی ظہورِ اسلام سے صدیوں پیشتر شروع ہو چکی تھی۔ عرب بڑے ماہر ملّاح اور سوداگر تھے۔ اُن کے جہاز ساحلِ عرب سے چین تک چلتے تھے۔ عرب سوداگر تجارتی مال کی لین دین کے لیے مکران، کچھ، ملابار، کارومنڈل، لنکا اور ملایا وغیرہ کی بندرگاہوں کا سفر کرتے تھے۔ تجارتی تعلّقات کی وجہ سے ان بندرگاہوں میں ان کی چھوٹی چھوٹی بستیاں بھی آباد ہو گئی تھیں۔ ان تجارتی تعلّقات کی یادگار وہ ہندستانی الفاظ ہیں جو عربی زبان میں داخل ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی کتاب "عرب اور ہند کے تعلّقات" میں اُن ہندی الفاظ کی طویل فہرست دی ہے جو قدیم عربی

لغت میں تجارتی چیزوں کے لیے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ صندل (چندن) کافور (کپور) اطریفل (تری پھل) نیلوفر (نیلو پھل) وغیرہ ہندی الاصل الفاظ ہیں۔ مولانا نے قرآن شریف میں بھی ہندی کے تین الفاظ کی نشان دہی کی ہے: مسک (موشکا) کافور (کپور) اور زنجبیل (زنجابیر)۔

بدیسی لفظوں کو اپنانے کی یہ ریت یک طرفہ نہیں تھی بلکہ ہندستانی زبانوں بالخصوص ساحلی زبانوں میں بھی بہ کثرت عربی الفاظ ملتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ضرور مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان زبانوں میں داخل ہو چکے تھے۔

غرضیکہ اس برصغیر کے باشندوں کے لیے عربی اور فارسی کے الفاظ ظہورِ اسلام سے پیشتر بھی نئے نہیں تھے۔ چنانچہ ان غیر ملکی لفظوں کا استعمال یہاں کی زبانوں میں مسلمانوں کے حملوں سے پیشتر شروع ہو چکا تھا۔ البتہ مسلمانوں کے اس ملک میں آباد ہونے کی وجہ سے فارسی اور عربی الفاظ و محاورات یہاں کی زبانوں میں کثرت سے استعمال ہونے لگے۔

اس ملک میں مسلمانوں کی آمد سے ایک نئے تہذیبی دور کا آغاز ہوا۔ وہ آریوں کی مانند فتح یابیوں کے پرچم اڑاتے ہوئے آئے۔ پہلے انھوں نے سندھ پر قبضہ کیا (محمد بن قاسم ۷۱۲ء) اور ٹھٹھہ، اُچھ اور ملتان میں اپنے مرکز قائم کیے۔ پھر دسویں صدی عیسوی میں امیر سبکتگین اور محمود غزنوی نے ہندستان پر پے در پے حملے کیے اور پنجاب تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ غزنوی فرماں رواؤں نے ڈیڑھ سو سال تک (۱۰۳۰ء - ۱۱۸۶ء) یہاں حکومت کی۔ ان کا پایۂ تخت لاہور تھا جو بہت جلد اسلامی تہذیب کا اہم مرکز بن گیا۔ مسلمان شاعر، صوفی، عالم اور درویش یہاں دور دور سے آنے اور آباد ہونے لگے۔ ۱۱۹۳ء میں سلطان شہاب الدین غوری نے دہلی اور قنوج کو فتح کر لیا۔ وہ خود تو یہاں نہیں ٹھہرا البتہ قطب الدین ایبک کو اپنا نائب بنا کر چھوڑ گیا۔ قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور غلام خاندان کی بادشاہت کی بنیاد رکھی۔ اب تقریباً سارا شمالی ہندستان مسلمان فرماں رواؤں کے زیرِ نگیں آ چکا تھا۔

مسلمان اپنے ہمراہ ایک نئی تہذیب لائے۔ اُن کا مذہب نیا تھا۔ اُن کی حکومت کے اصول اور آئین بھی نئے تھے اور اُن کے رہن سہن اور معاشرت کے طریقے بھی مختلف تھے۔ اُن کے آنے سے یہاں نئے آدابِ مجلس، نئے رسم و رواج، نئے علوم و فنون اور نئے ذوق و شوق نے رواج پایا۔ وہ اپنے ساتھ طرح طرح کے کپڑے اور لباس، آسائش اور آرائش کے نئے نئے سامان، خیمہ، قالین اور فرش فروش، نئے نئے پھل، پھول اور کھانے، نئی قسم کی صناعی اور ہنر مندی اور ان سب کے نام اور اصطلاحیں لائے جن کے لیے یہاں کی زبانوں میں الفاظ موجود نہ تھے۔ لامحالہ یہ نئے الفاظ لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔

> "سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک لسانی امتزاج وجود میں آیا۔ مسلمانوں نے اپنی ترکی اور فارسی ترک کر دی اور ہندوؤں کی زبان اختیار کر لی۔ مگر مسلمانوں نے اپنے فنِ تعمیر اور مصوری کی طرح اس میں بھی حالات اور ضروریات کے لحاظ سے ترمیم اور اصلاح کی اور اس طرح ایک نئی ادبی زبان پیدا کی جو اردو ہے۔ پھر ہندو مسلمان دونوں نے اسے اپنی زبان مان لیا۔ (ڈاکٹر تارا چند۔ INFLUENCE OF ISLAM IN INDIA.)

مسلمان فاتحین فارسی بولتے تھے۔ اُن کے دربار اور دفتر کی زبان بھی فارسی تھی لیکن یہاں کے لوگ دیسی زبانیں بولتے تھے۔ ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے ملکی، کاروباری اور معاشرتی ضرورت کے باعث مسلمان امرا اور لشکری بول چال میں ہندی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور مقامی باشندے فارسی الفاظ۔ کچھ عرصے تک تو مسلمانوں کا تعلق اپنے آبائی وطن ایران، افغانستان اور ترکستان سے رہا لیکن رفتہ رفتہ پرانے رشتے ٹوٹتے گئے اور وہ شادی بیاہ کر کے یہیں کے ہو گئے۔ نوکر چاکروں، بیوی بچوں اور ملک کے دوسرے لوگوں سے جو فارسی سے واقف نہ تھے انھیں ٹوٹی پھوٹی ہندی ہی میں باتیں کرنی پڑتی تھیں۔ ادھر اہلِ ملک کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی جس کا تعلق سرکاری دفتروں اور امیروں کی ڈیوڑھیوں اور شاہی لشکروں سے تھا۔ اُن میں بہت سے ایسے تھے جو مسلمان ہو گئے تھے۔ انھوں نے فارسی بھی سیکھ لی تھی۔ مگر ان کی اصل زبان ہندی ہی تھی۔ ان دونوں کے میل جول سے دھیرے دھیرے ایک مخلوط زبان کی بنیاد پڑی جو اُردو تھی۔ اس زبان کو ہندو مسلمان دونوں سمجھ سکتے تھے کیونکہ اس میں ہندی اور فارسی کے الفاظ ملے ہوئے تھے۔

ہم اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے کہ اُردو زبان کا بیج کہاں بویا گیا اور اس کے انکھوے کہاں پھوٹے۔ البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زبان کی علاقائی تقسیم جو آج ہے وہ آٹھ نو سو سال پیشتر نہ تھی۔ اس وقت تک اکثر دیسی زبانوں نے کوئی واضح شکل بھی اختیار نہیں کی تھی۔

قدیم مورخین نے اول تو زبان کے مسائل سے بحث ہی نہیں کی ہے اور اگر اشارۃً ذکر کیا ہے تو بڑے مبہم انداز میں۔ مثلاً امیر خسرو ہی کے بیانات کو لیجیے۔ وہ ایک طرف لاہور کی زبان کو لاہوری لکھتے ہیں۔ دوسری طرف فرماتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ء - ۱۱۲۱ء) نے ہندی میں بھی شعر کہے ہیں۔ نہ جانے لاہوری سے اُن کی کیا مراد ہے اور ہندی کا لفظ وہ تعمیمی طور پر استعمال کرتے ہیں یا اُن کی مراد وہ مخصوص زبان ہے جو شمالی ہند میں بولی جاتی تھی۔ اسی طرح فرشتہ جب یہ کہتا ہے کہ کالنجر کے راجہ نے محمود غزنوی کی خدمت میں ایک شعر ہندی زبان کا بھیجا تھا تو اس سے یہ دکنی مورخ کون سی زبان مراد لیتا ہے۔ مسعود سعد سلمان کا "ہندی" کلام معدوم ہے ورنہ بڑی آسانی سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اس نے جس زبان میں شعر کہے وہ ہندی تھی یا پنجابی۔ مولوی عبدالحق صاحب نے "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج (۱۱۷۳ء - ۱۲۶۵ء) کے کلام کے جو اُردو نمونے دیے ہیں وہ نہایت مشکوک اور غیر معتبر ہیں۔ کیونکہ صاف پتا چلتا ہے کہ یہ بارھویں اور تیرھویں صدی کی زبان نہیں بلکہ بہت بعد کی تصنیف ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اُردو" میں قدیم اُردو اور پنجابی کے صرفی اور نحوی قواعد کی مماثلت اور الفاظ اور کلمات کی مشابہت کی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُردو کا مولد پنجاب ہے لیکن اس مماثلت اور مشابہت سے تو فقط یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُردو اور پنجابی لسانی اعتبار سے سگی بہنیں ہیں اور قربت اور ہمسائگی کے باعث ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ حافظ محمود شیرانی صاحب نے ہمیں اس سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دیا کہ اگر اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی تو پھر وہ یہاں کے باشندوں کی مادری زبان کیوں نہیں بنی۔ یہاں کے عام لوگوں کی بولی پنجابی کیوں ہو گئی۔ حالانکہ یہ سارا علاقہ محمود غزنوی کے حملے سے اٹھارویں صدی عیسوی یعنی آٹھ سو برس تک مسلمانوں کے تسلط میں رہا۔ یہ خطہ اسلامی تہذیب کا نہایت اہم مرکز بھی تھا اور یہاں

مسلمانوں کی غالب اکثریت بھی آباد تھی پھر اُردو یہاں بول چال کی زبان کیوں نہ بنی جس طرح وہ گنگا جمنا کے دوآبے کی زبان بن گئی۔

مختصر یہ کہ اُردو کی ابتدا کے بارے میں ہم یقین سے قطعاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مغربی ہندی میں فارسی کا پیوند لگا تو یہ زبان وجود میں آئی مغربی ہندی سے مُراد وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ غزنوی عہد میں لاہور اور ملتان وغیرہ میں بھی یہی زبان رائج تھی تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اُردو کی داغ بیل اسی خطے میں پڑی۔

تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں صدی کا زمانہ اُردو زبان کا تشکیلی دور ہے۔ اس دور میں بقول مولوی عبدالحق اُردو کٹھالی میں پڑی گل رہی تھی ہنوز سونا نہیں بنی تھی۔ اس دور میں اُمرا اور عمائدینِ سلطنت نے اُردو کو مُنہ نہیں لگایا ممکن ہے کہ یہ لوگ گھروں میں یہی زبان بولتے ہوں مگر ان کی تحریر اور تصنیف کی زبان مدت تک فارسی ہی رہی۔ یہی زمانہ تصوّف اور بھگتی کے عروج کا بھی ہے۔ اس دور میں یہاں بڑے بڑے صُوفی، سنت اور درویش پیدا ہوئے۔ اور لوگوں نے ان کی تعلیم اور ہدایت سے فیض اُٹھایا بھگتی اور تصوّف کے فروغ پانے کا سبب یہ تھا کہ مُسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیب میں آہنگ و امتزاج کے بغیر ملک کی گاڑی آگے نہیں چل سکتی تھی اور اس کی ایک ہی صُورت تھی۔ وہ یہ کہ مذہبی اختلافات کو ہوا دینے اور نفرت، تعصب و عداوت کی آگ بھڑکانے کے بجائے پیار، نرمی اور رواداری کی باتیں کی جائیں۔ باطن کی پاکیزگی اور قلب و نظر کی اصلاح پر زور دیا جائے۔ کرم اور گیان، تپ اور تپسّیا، عبادت اور ریاضت، مالا اور تسبیح اور ذات پات کی ظاہرداریاں ترک کر دی جائیں۔ مذہب کی نمائش کرنے والے اور علم پر اترانے والے مولویوں اور پنڈتوں کی ریاکاریوں کا پردہ چاک کیا جائے۔ خود غرضی اور خود نمائی کے بجائے دردمندی اور دل جوئی کی تلقین کی جائے۔ پرم آتما اور جیو آتما، خالق اور مخلوق میں محبت کا رشتہ استوار کیا جائے۔ من میں پریم کی جوت جگائی جائے تاکہ بندہ دُنیاوی آلائشوں سے پاک اور عشقِ الٰہی سے سرشار ہو جائے۔ دوئی کا فرق مٹ جائے اُسے ہر شے میں خُدا کا جلوہ نظر آنے لگے۔ اور اس کی نگاہ میں ہندو اور مُسلمان، کافر اور دیندار، زاہد اور گنہ گار، دولت مند اور محتاج، بادشاہ اور گدا سب برابر ہوں۔

یہ تحریک رفتہ رفتہ سارے مُلک میں پھیل گئی۔ اور سادھو سنت، صُوفی اور درویش ہر جگہ اپنے اپنے انداز میں پریم بھگتی کا پرچار کرنے لگے مگر عوام کے دلوں کو موہ لینے کے لیے عوام ہی کی بولی کارگر ہوتی ہے اس لیے ان بزرگوں نے اُردو کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنایا اور اس زبان کو بالواسطہ طور پر فروغ دیا۔ چنانچہ اُردو کے اس دور کی نمائندگی صُوفی اور سنت ہی کرتے ہیں۔ ان میں حضرت امیر خسروؒ، حضرت شیخ بُو علی قلندرؒ پانی پتی (وفات ۱۳۲۳ء)، شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیری (بہار ۱۲۶۳ء-۱۳۸۰ء) سید محمد حسین گیسو دراز بندہ نوازؒ (۱۳۲۱ء-۱۴۲۲ء) شمس العشاق شاہ میراں جی (بیجاپور وفات ۱۴۹۶ء) کبیر صاحب (بنارس ۱۴۴۰ء-۱۵۱۸ء)، سید محمد جونپوری (۱۴۴۳ء-۱۵۰۴ء)، گرو نانک (۱۴۶۹ء-۱۵۳۸ء) اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی متخلص بہ الکھ داس (۱۴۵۵ء-۱۵۳۸ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس دور کی اُردو کی خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ ہندی الفاظ کی بہتات ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ خال خال پائے جاتے ہیں
۲۔ فارسی اور عربی کی مذہبی اور صُوفیانہ اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں لیکن شعرا ہندی اور سنسکرت کے ٹھیٹھ الفاظ اور عارفانہ اصطلاحیں بھی بڑی بے تکلفی سے لکھ جاتے ہیں۔
۳۔ بحریں اور اصنافِ سخن سب ہندی ہیں۔ دوہے اور چوپائی کا رواج عام ہے۔ بیان کا اسلوب، کلام کا رنگ نیز تشبیہات و استعارات بھی زیادہ تر ہندی ہیں۔ حتیٰ کہ یہ حضرات ہندو دیو مالا کی تلمیحات سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہندی شاعری کی مانند عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہوتا ہے۔ اور خُدا یا گرو معشوق ہے۔ عورتوں کے لوازمات بطور استعارہ تفصیل سے بیان کیے جاتے ہیں۔ مثلاً مہندی، چرخہ، زیور، چندری، میکہ، سسرال عام استعارے ہیں۔
۴۔ عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ اسی طرح لکھے جاتے ہیں جس طرح عوام کی زبان پر تھے۔ اصل کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

امیر خسرو اُردو زبان کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ وہ پٹیالی میں پیدا ہوئے جو دہلی سے تقریباً سو میل کے فاصلے پر علی گڑھ اور آگرہ کے درمیان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اُن کی ماں ہندستانی تھیں البتہ باپ لاچینی ترک تھے۔ ہندی اُن کی مادری زبان تھی اور وہ اس پر فخر کرتے تھے۔ وہ فارسی کے شاعر ہیں مگر جیسا کہ ہم اُوپر لکھ چکے ہیں اُنھوں نے ہندی زبان میں بھی شعر کہے ہیں۔ بیسیوں گیت، پہیلیاں، دو سُخنے، کہہ مُکرنیاں اور انملیاں ان سے منسوب ہیں۔ مگر صاحبِ آبِ حیات نے امیر خسرو کے کلام کے جو نمونے دیے ہیں وہ مُستند نہیں معلوم ہوتے البتہ قیاس کہتا ہے کہ وہ اصل سے زیادہ مختلف نہیں ہوں گے۔

ترور سے اک تریا اُتری اُس نے بہت رجھایا — باپ کا اُس کے نام جو پُوچھا آدھا نام بتایا
آدھا نام پتا پر پیارا بُوجھ پہیلی موری — امیر خسرو یوں کہیں اپنا نام نبولی

سگری رین موہے سنگ جاگا — بھور بھئی سو بچھڑن لاگا
واکے بچھڑے پھاٹت ہیا — اے سکھی ساجن؟ نا سکھی دیا

ایک غزل بھی امیر خسرو کے نام سے مشہور ہے جس کا پہلا مصرع فارسی میں ہے اور دُوسرا اُردو میں۔

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں — کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز از زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ — سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

میر تقی میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعرا" میں امیر خسرو کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جس کی نوعیت بہ اعتبار زبان و بحر وہی ہے جو متذکرہ بالا غزل کی ہے۔

امیر خسرو کا اُردو کلام جو ہم تک پہنچا ہے وہ اتنا مختصر اور مشکوک ہے کہ اُس کے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنا بہت مشکل ہے۔ البتہ ان سے جو

غزل اور قطعہ منسوب ہیں اگر وہ اُن کا یا اُن کے عہد کا کلام ہے تو یہ واقعی نئی زبان میں ایک غیر معمولی تجربہ ہے۔ خسرو امیر ابن امیر تھے۔ وہ ساری عمر شاہی
درباروں سے وابستہ رہے جہاں فارسی کا رواج تھا۔ وہ خود بھی فارسی کے ممتاز ترین شاعر تھے مگر ان کا تعلق شیخ نظام الدین اولیاء کے قلندرانہ دربار سے
بھی تھا جہاں دہلوی ہندی بولی جاتی تھی۔ خود اُن کی مادری زبان بھی ہندی تھی۔ ان حالات میں ہندی اور فارسی کو ملا کر غزل کہنے کے لیے اُن سے زیادہ موزوں
کون تھا۔ اس لیے ہمیں اس تجربے پر حیرت نہیں ہونی چاہیے بلکہ اسے فارسی اور اردو کی درمیانی کڑی سمجھنا چاہیے۔ امیر خسرو کے ان اشعار کی بحر فارسی
ہے۔ البتہ قوافی ہندی ہیں۔ پہلا مصرع ہر شعر کا فارسی ہے اور دوسرا ہندی۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی کھچڑی غزل اور قطعہ اُن کے ذہن کی ایجاد ہو اور یہ پہلا
تجربہ انھیں نے کیا ہو یا دہلی کے درباری حلقوں میں اس ہیچ میل مٹھائی کا رواج خسرو سے بیشتر ہو چکا ہو۔ بہر حال حقیقت جو بھی ہو یہ ہے بہت معنی خیز تجربہ
اس قسم کے اشعار ہمیں مغلیہ عہد کے شاعروں کے کلام میں بھی ملتے ہیں۔

خسرو ہی عہد کے دوسرے صوفیوں کے بھی اکا دُکا شعر ہم تک پہنچے ہیں۔ اُن میں اور خسرو کی ہندی زبان میں کوئی لسانی فرق نہیں ہے۔ ایک
دوہا جو شیخ بو علی قلندر سے منسوب ہے عورتوں کے جذبات کو بہت سادے اور پُراثر انداز میں پیش کرتا ہے ؎

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

سیّد محمد حسینی گیسو دراز اُردو کے سب سے پہلے صاحبِ تصنیف بزرگ مانے گئے ہیں۔ اُن کا رسالہ "معراج العاشقین" نثر میں ہے۔ اسے مولوی
عبدالحق صاحب نے دریافت کیا اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی زبان دکنی ہے اور اُس وقت کی دہلوی سے لگا نہیں کھاتی۔

اِسی بنا پر مولوی نصیر الدین ہاشمی مصنّف "دکن میں اُردو" یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مصنّف نے یہ رسالہ دکن میں لکھا تھا۔ سیّد بندہ نواز گیسو دراز تمام عمر دہلی میں رہے
البتہ اُن کی زندگی کے آخری دس سال گلبرگہ میں گزرے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے دس سال میں (وہ بھی پیرانہ سالی میں) دکنی میں اتنی مہارت پیدا
کر لی کہ صاحبِ تصنیف ہو گئے۔ یہ بات مولوی عبدالحق صاحب کو بھی کھٹکتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھی دبی زبان سے اپنے شک کا اظہار کیا ہے
(اُردو کی ابتدائی نشوونما ص۴۵) ہمارا خیال ہے کہ کسی خوش عقیدہ دکنی مُرید نے یہ رسالہ مُرشد کے انتقال کے بعد لکھا اور ان سے منسوب کر دیا ہے معراج العاشقین
کے قدیم ترین نسخہ کا سنِ کتابت ۹۰۶ھ/ ۱۵۰۰ء ہے۔ اس لحاظ سے معراج العاشقین اُردو نثر کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ خواہ اس کا مصنّف کوئی
ہو۔ تحریر کا نمونہ یہ ہے:

"انسان کے پوُجنے کوں پانچ تن۔ ہر ایک تن کوں پانچ دروازے ہیں۔ ہور پانچ دربان ہیں۔ پیلا تن واجب الوجود، مقام اس کا
شیطانی، نفس اس کا امّارہ یعنی واجب کی آنک سو غیر نہ دیکھنا، حرص کے کان سوں غیر نہ سُننا سو، حسد کے نک سوں بدبوئی نا لینا سو، بُغض
کی زبان سوں بدگوئی نہ کرنا سو، کنیا کی شہوت کوں غیر جاگہ نہ خرچنا سو، پیر طبیب کامل ہونا، نبض پہچان کوں دوا دینا۔"

اس دور کے سب سے بڑے صوفی شاعر کبیر صاحب ہیں۔ خوش قسمتی سے اُن کے کلام کا ایک ایسا مستند نسخہ دستیاب ہوا ہے جو ان کی وفات
سے چودہ برس پیشتر مرتب ہو چکا تھا۔ (کبیر گرنتھاولی از شیام سُندر داس ص۲ الٰہ آباد ۱۹۲۸ء) اس لیے ان کے دوہوں، بھجنوں، ساکھیوں اور چوپائیوں سے
پندرھویں اور سولھویں صدی کی اُردو کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولوی عبدالحق، کبیر صاحب کو اُردو کے اوّلین بانیوں میں شمار کرتے ہیں۔
کبیر صاحب کی ذات اور اُن کی شاعری اس نئی تہذیب اور نئی زبان کا سچا نمونہ ہے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے شمالی ہندستان میں پیدا ہو رہی
تھی۔ وہ ایک ہندو عورت کے بطن سے پیدا ہوئے۔ بنارس کے ایک مسلمان نے انھیں پالا پوسا۔ وہ ساری عمر تانے بانے بُنتے اور اپنے اشعار کے
ذریعہ وحدانیت، بھگتی اور پریم کے گیت گاتے رہے۔ وہ بھگت رامانند کے چیلے تھے مگر مانک پور کے صوفی شیخ تقی سے بھی عقیدت رکھتے تھے ؎

مانک پور میں کبیر بسے ری　　مدحت سُن شیخ تقی کے ری
اوجی سُنی جونپور تھانا　　جھونسی سُنی پیرن کے ناما

(شیخ تقی کی تعریف سُن کر کبیر کچھ دن مانک پور میں رہا۔ اُس نے جونپور میں عوفی کا حال سُنا اور جھونسی (الٰہ آباد) میں پیروں کے نام)

کبیر صاحب کی زبان پوربی ہندی ہے مگر اتنی آسان اور سادہ کہ اب بھی سمجھی جا سکتی ہے۔ اُن کی شاید ہی کوئی چوپائی ایسی ہو جس میں دو چار لفظ
فارسی عربی کے نہ آ گئے ہوں۔ کبیر صاحب پڑھے لکھے نہ تھے لیکن وہ ان الفاظ کو بڑی بے تکلفی اور روانی سے استعمال کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے
کہ یہ غیر ملکی الفاظ کبیر صاحب کے زمانے میں بنارس جیسے شہر میں بھی زبان کا حصہ بن چکے تھے اور عام لوگ انھیں سمجھتے تھے۔ اُن کے کلام کا نمونہ دیکھیے ؎

اوگن کئے تو بہو کیئے، کرت نہ مانی ہار
بھاوے بندہ بخشیے، بھاوے گردن مار

(گناہ تو بہت کیے اور کرتے ہوئے ہار نہ مانی۔ چاہے بندے کو بخشیے چاہے گردن ماریے)۔ اس دوہے میں 'بخشیے' کا لفظ قابلِ غور ہے۔ اس سے
ثابت ہوتا ہے کہ فارسی امر میں ہندی کی علامت مصدری کا اضافہ کر کے اُردو کے نئے مصدر بنانے کا رواج کبیر کے وقت میں عام تھا۔ چنانچہ بخشنے خالص
اُردو ترکیب ہے۔ اسے نہ فارسی کہہ سکتے ہیں اور نہ ٹھیٹ ہندی۔

چلن چلن سب کوئی کہیں، مو ہے اندیسا اور
صاحب سے پری چے نہیں، پہونچیں گے کوہی ٹھور

(چلنے کو سب کہتے ہیں، مجھے اور ہی اندیشہ ہے۔ صاحب سے جان پہچان تو ہے نہیں کیسے پہنچیں گے)۔

جُوا، چوری، مکھبری، بیاج، گھوس، پر نار
جو چاہے دیدار کو، اتو بست بنار

(جوا، چوری، مخبری، سود، رشوت، پرائی عورت۔ اگر دیدار چاہتا ہے تو ان چیزوں کو چھوڑ دے)۔

اوگن میرے باپ جی، بکس گریب نواج
جو میں پوت کپوت ہوں تؤ پتا کی لاج

(اے باپ جی، تم غریب نواز ہو۔ میرے گناہوں کو بخش دو۔ اگر میں ناخلف بیٹا ہوں تب بھی باپ ہی کو اس کی شرم ہے)۔

موکو کہاں ڈھونڈے رے بندے میں تو تیرے پاس میں
نا میں دیول، نا میں مسجد نا کعبے کیلاس میں

والے بندے، مجھے کہاں ڈھونڈتا ہے۔ میں تو تیرے پاس ہوں، نہ میں مندر میں ہوں نہ مسجد میں ہوں، نہ کعبے میں، نہ کیلاش میں) غرضیکہ اُن کا سارا کلام قریب قریب اِسی زبان میں ہے۔

اس دور کی دو مشہور شخصیتیں قطبن مُصنّف مرگاوتی (۱۵۰۴ء) اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی (وفات ۱۵۳۸ء) المتخلص بہ الکھ داس ہیں۔ مرگاوتی ہندی کی پہلی کتاب ہے جس میں حقیقیہ افسانے کو نظم کیا گیا ہے۔ یہ ملک محمد جائسی کی پدماوت سے ۳۷ سال پیشتر لکھی گئی تھی۔ اس کی بحر ہندی چوپائی کی ہے ؎

شیخ بڈھن جگ ساچا پیر — نام لیت سُدھ ہوئے سریر
شاہ حسین اہے بڑ راجا — چھتر سنگاسن اُنھو ساجا

اس دور کے ایک اور بزرگ گرو نانک ہیں۔ وہ ضلع شیخوپورہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے گر سنتوں سادھوؤں کی مانند ان کا زیادہ وقت سفر اور سیاحت میں گزرا۔ وہ گاؤں گاؤں پھرتے اور عوام کو بت پرستی، ذات پات کی تمیز اور دوسری سماجی برائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے۔ سکھوں کی مقدس کتاب آدی گرنتھ صاحب میں جو اشلوک گرو نانک جی سے منسوب ہیں اُن کی زبان بھی ملی جلی ہندی ہے۔ جس میں فارسی عربی الفاظ بھی موجود ہیں۔ مثلاً دُعا، حکم، نیزہ، وزیر، قالب، بہار، فانی، کوزہ، حکمت، آتش، عشق، محبت، بخشش، قرآن، روزہ، نماز، کعبہ، کلمہ وغیرہ (پنجابی شاعراں دا تذکرہ از مولا بخش کشتہ صفحہ ۴۸ لاہور، ۱۹۶۰ء) البتہ گرو نانک جی کی ہندی پر پنجابی کی چھاپ بہت گہری ہے۔ شاید اس وقت تک پنجابی زبان کی باقاعدہ تشکیل نہیں ہوئی تھی اور وہ ہندی سے بہت قریب تھی۔ گرو نانک جی فرماتے ہیں کہ:

ہور شریک ہوئے کوئی تیرا تس اگے تدھ آکھاں — تدھ اگے تدھ صالاحیے میں اندھے ناؤں سُجاکھا

(اگر تیرا کوئی شریک ہو تو پھر اُس کے سامنے کچھ کہوں۔ تیرے سامنے تیری ہی تعریف کرتا ہوں میں اندھا نہیں آنکھوں والا ہوں)۔

وید بُلایا ویدگی، پکڑ ڈھنڈولے بانہہ — بھولا وید نہ جانیے، کرک کلیجے مانہہ

(میں نے وید کو علاج کے لیے بُلایا۔ وہ (مرض کو) میری بانہہ میں ڈھونڈھتا ہے۔ وید کو بھولا مت جانو (مگر) درد تو میرے کلیجے میں ہے)۔

نانک بدرا مال کا بھیتر دھریا آن — کھوٹے کھرے پرکھیین صاحب کے دیبان

(نانک نے مال کی تھیلی اندر رکھ دی۔ اب خُدا کے دیوان کھوٹا کھرا پرکھیں گے)۔

پندرھویں صدی میں اُردو نے اتنی ترقی کر لی کہ رفتہ رفتہ اس کی رسائی سرکار دربار میں بھی ہونے لگی۔ مسلمانوں کو اِس مُلک میں آئے ہوئے اب صدیاں گزر چکی تھیں۔ ان کی کئی پیڑھیاں یہیں کی مٹی کا پیوند بن چکی تھیں۔ لہٰذا وہ فارسی سے دُور ہوتے جا رہے تھے اور اُردو کو اپنانے لگے تھے۔ دربار کی سرکاری زبان ہنوز فارسی تھی مگر دفتروں میں نئی زبان رائج ہو چکی تھی۔ خود بادشاہ اور اُمرائے سلطنت اس زبان کو فارسی پر فوقیت دینے لگے تھے۔ حُسنِ اتفاق سے پندرھویں سولھویں صدی کے لودھی اور سوری فرماں روا ہندستانی تھے۔ لودھی خاندان کا بانی بہلول خاں پنجاب کا گورنر رہ چکا تھا اور سرحد کے لودھی قبیلے سے تھا۔ اس کے خاندان نے ۷۵ سال (۱۴۵۱ء - ۱۵۲۶ء) تک دہلی پر حکومت کی۔ اسی طرح سُوریوں کی تین پُشتیں بہار میں گزر چکی تھیں ان پٹھان بادشاہوں کو فارسی زبان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا بلکہ وہ فارسی کو ناپسند کرنے لگے تھے۔ چنانچہ ایک مؤرخ شیر شاہی دور سے اس بات پر بہت خفا ہے:

"بحکم آنکہ جہل و بدبختی بر افغاناں غالب است تا ہر کہ بزبانِ فارسی نُطق و تکلّم کند اُو را دشمن می گیرند" (بحوالہ پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۷)

حافظ محمود شیرانی کو اس کا افسوس ہے کہ تصوف اور بھگتی کی تحریک اور پٹھان فرمانرواؤں کے طرزِ عمل کے باعث "فارسی ہندستان میں ٹھٹھر گئی" مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ فارسی لاکھ ترقی یافتہ سہی وہ تھی ایک غیر ملکی زبان۔ فارسی کبھی بول چال کی زبان نہیں بن سکتی تھی اور نہ اُسے راج سنگھاسن سے ہٹائے بغیر ملکی زبانوں کو فروغ ہو سکتا تھا۔ فارسی کے زوال پر اظہارِ افسوس کرنے کے باوجود شیرانی صاحب معترف ہیں کہ:

"اگر مغلوں کا حملہ ہندستان میں خلل انداز نہ ہوتا تو اُردو بہت جلد سرکاری اور درباری زبان بن جاتی"

مُغلوں کے ابتدائی دور میں اُردو پر شمالی ہندستان میں جو کچھ بیتی اس کا ذکر کرنے سے پہلے ہم گجرات اور دکن میں اُردو زبان کے ارتقا کا جائزہ لیں گے۔

گجرات میں اُردو

سلطان علاؤالدین خلجی نے ۱۲۹۷ء میں گجرات فتح کیا اور چودھویں صدی کے آخر تک یہ علاقہ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ یہ بڑا خوش حال اور زرخیز صوبہ تھا۔ اس کی سرحد مالوہ سے کچھ کے ساحل تک اور راجپوتانہ سے تھانہ (بمبئی) تک پھیلی ہوئی تھی۔ سورت اور دمن اس کی مشہور بندرگاہیں تھیں۔ گجرات فتح ہوا تو دہلی کے اُمراء اور صوفیا کے علاوہ ہزاروں لشکری اور ہنرمند گجرات جا کر آباد ہو گئے یہ لوگ اپنے ہمراہ وہی ملی جلی ہندی زبان لے گئے جو دہلی اور نواحِ دہلی میں بولی جاتی تھی۔ گجرات میں صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی اور سورت، پٹن اور احمد آباد وغیرہ دہلوی تہذیب کے اہم مرکز بن گئے۔ اس کا اثر وہاں کی معاشرت پر طرح طرح سے پڑا۔ خاص کر وہاں کی زبان پر جو بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئی۔ "یہ بات قابلِ غور ہے کہ دلی کی حکومت یا اہلِ دہلی نے جس جس خطے میں قدم رکھا، خواہ وہ پنجاب ہو یا گجرات، دکن کے صوبے ہوں یا مدراس، انھوں نے زبان پر اپنا نقش ضرور چھوڑا ہے" (تذکرہ شعرائے گجرات بحوالہ کیفیہ از پنڈت دتاتریہ کیفی صفحہ ۳۶)

۱۳۹۱ء میں جب تیمور کے حملے کے باعث دہلی کی حکومت کمزور ہو گئی تو گجرات کا صوبے دار ظفر خاں خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ اس کے خاندان نے پونے دو سو سال تک حکومت کی (۱۵۷۲ء)۔ گجرات کے بادشاہوں میں احمد شاہ اور سلطان محمود بیگڑہ اپنی خوش انتظامی اور علم پروری کے لیے مشہور رہیں۔ اُن کے عہد میں اُردو زبان کو جو گجری کہلاتی تھی بڑا فروغ ہوا۔ اس کا اثر بیجاپور اور دکن کے دوسرے علاقوں پر بھی پڑا۔ اُس وقت کی گجراتی اُردو مقامی رنگ سے قطع نظر شمالی ہند کی اُردو سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ گجرات میں متعدد صوفی شاعر گزرے ہیں۔ ان میں شاہ علی محمد جیو گام دھنی (وفات ۱۵۱۵ء) قاضی محمود دریائی (وفات ۱۵۳۴ء) میاں خوب محمد چشتی (وفات ۱۶۱۴ء) اور بابا شاہ حسینی کی باقاعدہ تصانیف اُردو میں ہیں۔ ان کے علاوہ شمس العشاق شاہ میراں جی (وفات ۱۴۹۶ء) اور اُن کے بیٹے شاہ برہان الدین جانم جو بیجاپور کے رہنے والے تھے اپنی زبان کو گجری ہی کہتے ہیں

شاہ میراں جی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یہ سب عالم تیرا — رزّاق سبھوں کیرا
تجھ بن اَور نہ کوئے — تا خالق دُوجا ہوئے
جے تیرا ہوئے کرم — تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھ کو دھاؤں — اور تیرا نام لیؤں

قاضی محمود دریائی فرماتے ہیں ؎

جے نہ سمایا وصول، ملافے کبھو نہ پرگٹ شوق — جے نہ عشقوں آنکھوڑا لے، کبھو نہ پایا ذوق
چاری پھوڑ سنور بنی کیسی — اِک تل آنکھ نہ لائی
پا پچوں وقت نماز گزارو دائم پڑھو قرآن — کھاؤ حلال، لکھ ساچا راکھو درست ایمان

اور شاہ علی محمد جیو کہتے ہیں کہ ؎

بھیس بندو کے کر سو بندگی اوبھا ہو ہو (اُٹھ اُٹھ کر) نماز گزاروں
ہوں (ہیں) حاجی ہوں، کعبہ آ ہوں، آپیں آپیں اوبرواروں

گجراتی اُردو میں گجراتی زبان کے الفاظ کا استعمال قدرتی بات ہے۔ چنانچہ ہوں بمعنی میں، ڈوسی (بڑھیا) اونڈا (گہرا) چھولی (چھوٹی لہر) ہب یا ہبیں (ہوتے) جمنا (دایاں) اور پپوٹے یا فوفوٹے (حباب) گجراتی الفاظ ہیں جو گجری شاعروں کے کلام میں ملتے ہیں۔

دکن میں اُردو

دکن میں اُردو کی ابتدا علاؤ الدین خلجی اور ملک کافور کے حملوں سے ہوئی (۱۳۰۲ء - ۱۳۱۳ء) مالوہ، اُجین اور منڈو کو فتح کرنے کے بعد شاہی لشکر نے دکن کا رُخ کیا اور دیوگیر (دولت آباد) اور ورنگل پر قبضہ کرتا ہُوا راس کماری (مابر) تک پہنچ گیا۔ خلجیوں کے بعد جوناخاں نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق کے عہد میں (۱۳۲۱ء) دیوگیر، ورنگل اور بیدر کو دوبارہ فتح کیا اور وہاں اپنے نائب متعین کر دیے۔ پھر جب جوناخاں سلطان محمد تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا تو اس نے ۱۳۲۷ء میں اپنا پایۂ تخت دولت آباد منتقل کر دیا۔ اور دہلی کے اُمراء اور عمّال، اہلِ حرفہ اور تجار، عُلماء و فضلا اور شاہی لشکر کو ترکِ وطن کر کے دولت آباد میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ دو سال کے بعد بادشاہ خود تو دہلی واپس چلا گیا مگر دہلی کے بہ کثرت باشندے دکن ہی میں آباد ہو گئے۔ اِس طرح دکن میں اُردو کی داغ بیل پڑی۔

دکن میں اُردو کے فروغ کا ایک سبب یہ ہُوا کہ حسن گنگو بہمنی نے دکنی اُمرا کی مدد سے ۱۳۴۷ء میں دولت آباد فتح کر لیا اور دہلی سے رشتہ توڑ کر خود مختار بہمنی سلطنت کی بُنیاد رکھی۔ بہمنی فرماں رواؤں نے اُردو کی یہاں تک سرپرستی کی کہ اِس زبان کو دفتروں کی سرکاری زبان قرار دے دیا۔ (دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی صت ۲۴ لاہور ۱۹۶۰ء) فیروز بہمنی اور محمود گاواں (بہمائیوں کا بہمنی وزیر) علم و ادب کے بڑے سرپرست گزرے ہیں۔ سیّد عین الدین گنج العلم حضرت نظام الدین اولیاؒ کے ایک سو مریدوں کے ہمراہ اسی زمانے میں دکن آئے۔ خواجہ سیّد محمد حسینی گیسو دراز نے بھی اسی عہد میں گلبرگہ میں سکونت اختیار کی۔ بہمنی دَور کے اُردو ادیبوں میں سلطان احمد شاہ ثالث (۱۴۶۳ء - ۱۴۸۲ء) کا درباری شاعر نظامی قابلِ ذکر ہے۔ اُس سے ایک مثنوی "کدم و پدم" منسوب ہے۔

نصیر الدین ہاشمی صاحب اس دَور کی دکنی اُردو پر تبصرہ کرتے ہُوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس دَور میں دکھنی زبان یا قدیم اُردو بول چال سے گزر کر تحریر کی صُورت میں آ گئی تھی۔ نظم اور نثر دونوں اس زبان میں لکھے جاتے تھے۔ زیادہ تر تصوّف کا رواج تھا۔ مگر ساتھ ساتھ افسانہ (عشقیہ) اور تاریخ کا موضوع بھی اختیار کیا گیا تھا . . . . جو نمونے نظم اور نثر کے ملتے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں ہندی کے الفاظ زیادہ ہیں۔ (البتہ) بحر اور قافیہ و ردیف میں فارسی کا تتبع کیا جاتا تھا۔" (صفحہ ۴۰ - ۴۱)

اُردو زبان اور ادب نے تین سو سال تک جتنی ترقی دکن میں کی اُس کی نظیر پُورے مُلک میں نہیں ملتی۔ اِسی لیے دکن کے لوگ اگر یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ اُن کے بزرگوں نے اُردو کو نکھارا، بنایا، سنوارا اور اس میں ادبی شان پیدا کی تو یہ دعوٰی بے بُنیاد نہیں ہے۔

قطب شاہی (گولکنڈہ ۱۵۱۸ء - ۱۶۸۷ء) اور عادل شاہی (بیجاپور ۱۴۸۹ء - ۱۶۸۶ء) دَور میں اُردو کو دکن میں بہت فروغ ہُوا اور وہ مُلک کی سب سے مقبول زبان بن گئی۔ دکنی ادیبوں، صُوفیوں اور دانش وروں نے اُردو کا دامن نئے نئے خیالات اور نئی نئی اصنافِ سخن سے بھر دیا۔ الفاظ اور محاورات کا ذخیرہ بھی پہلے سے بہت بڑھ گیا اور اب اُردو اس قابل ہو گئی کہ مذہب، فلسفہ، تصوّف اور تمثیلی قصّوں کے باریک سے باریک نکات بیان کر سکے اور نازک سے نازک جذبات کا اظہار کر سکے۔ مگر اُردو کو زبان و بیان کی یہ دولت فارسی کی بدولت نصیب ہوئی۔

حیرت ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب اور دُوسرے محققین اُردو زبان میں فارسی تشبیہات و استعارات، فارسی تلمیحات و محاورات کی بُہتات کا الزام لکھنوی شاعروں کے سر رکھتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُردو زبان آسان اور عام فہم تھی۔ شاہانِ اودھ کی تہذیب سے متاثر ہو کر لکھنوی شاعروں نے اِس سادہ زبان میں عربی فارسی لفظوں کی بھرمار کر دی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو پر فارسی کی ملمع کاری دکن میں صدیوں پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اُس کے اسباب تاریخی ہیں:

دکن پر ایرانی تہذیب کا اثر ہمایُوں بہمنی اور محمود شاہ بہمنی کے وزیر خواجہ محمود گاواں (قتل ۱۴۸۱ء) کے زمانے ہی میں بڑھنے لگا تھا۔ محمود گاواں بڑا صاحبِ فضل و کمال تھا اور علم و فن کا قدردان۔ ایرانی امیروں اور دانش وروں کو وہ خاص طور پر بہت نوازتا تھا۔ کیونکہ وہ خود بھی ایرانی تھا۔ چنانچہ اس کے عہد میں بہمنی دربار میں دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک ایرانی اُمراء کی اور دُوسری خالص دکنی اُمراء کی جن کا رہنما ایک نومسلم ملک حسن نظام الملک بحری تھا (اسی کی سازش سے بالآخر خواجہ قتل ہُوا)۔ قطب شاہی اور عادل شاہی دَور میں ایرانی تہذیب کو بڑا فروغ ہُوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یوسف عادل (عادل شاہی سلطنت کا بانی) اور سلطان قلی (قطب شاہی سلطنت کا بانی) دونوں ایرانی تھے۔ یُوسف عادل کو تو خواجہ محمود گاواں نے اپنا بیٹا بنایا تھا اور دولت آباد کا سر لشکر مقرر کیا تھا۔ بقول فرشتہ "خاندانِ بہمنیہ میں اس سے بڑا منصب کوئی نہیں ہوتا تھا۔" (جلد اوّل صت ۹۴) اسی طرح سلطان قلی خواجہ

کی سفارش پر گولکنڈہ کا جاگیردار اور سپہ سالار مقرر ہُوا تھا۔ ان دونوں سلطنتوں کے تعلقات بھی ایران سے بہت خوش گوار تھے۔ چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی فیاضیوں اور علم پروریوں کا شہرہ سُن سُن کر ایرانی عُلما، شعرا اور اُمرا دکن میں آتے اور دولت اور عزّت سے سرفراز ہوتے۔ خواجہ حافظ نے بھی محمود شاہ ثانی (۱۳۷۸ء-۱۳۹۶ء) کے درباری میر سیفُ اللہ شیرازی کی دعوت پر دکن کا عزم کیا تھا مگر ہُرمز میں سمندر طوفانی ہُوا تو حافظ نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک غزل بھیج کر معذرت کر دی۔ اس پر حافظ کو ایک ہزار طلائی تنکہ انعام ملا۔ (فرشتہ جلد اوّل ص۸۷)

رفتہ رفتہ اُردو زبان بھی ایرانی تہذیب سے اتنی مُتاثر ہوئی کہ اس کی ہیئت اور ماہیت میں انقلاب آ گیا۔ دکنی شاعروں نے فارسی کی تقلید میں اُردو میں بھی حمد، نعت، غزل، قصیدے اور رباعیاں، ترجیع بند، نوحے اور مرثیے لکھنے شروع کر دیے۔ اُردو میں سب سے پہلی مثنوی نظامی بیدری نے لکھی۔ اس میں حُسن و عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ اُردو کی سب سے قدیم غزل دکنی شاعر مُشتاق کی ہے جو سُلطان محمّد شاہ بہمنی (وفات ۱۴۸۲ء) کے آخری زمانہ میں تھا۔ غزل کے دو شعر یہ ہیں:

تجھ دیکھتے دل تو گیا ہور ہیو اُپر بے کل گھڑی — دیکھے تو نہ جیو کے اُپر نیں دیکھے تو نیں کل گھڑی

آبِ حیات اور لبِ ترے جاں بخش و جاں پرور لَبے — مُشتاق بوسے سوں پیا امرت بھری اد کل گھڑی

سب سے قدیم قصیدے کا مُصنّف بھی مُشتاق ہی ہے جس نے سیّد برہانُ الدّین شاہ خلیلُ اللہ کی مدح کی ہے (دکنی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محی الدّین زور کراچی ص۱۶)

اِسی زمانے میں فارسی تشبیہوں، تلمیحوں، اِستعاروں اور قصّوں کا رواج بڑھا اور یہ نئے تجربے اتنے مقبُول ہُوئے کہ کچھ عرصے بعد فارسی کی یہی خصوصیات اُردو کا امتیازی نشان بن گئیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اُردو کے مزاج، ماحول اور روایت میں فرق آ گیا۔ یہ درست ہے کہ پُرانی روایتیں ہنُوز بالکل مُردہ نہیں ہوئی تھیں اور زبان کو ہندی کی مٹھاس اور گھلاوٹ کا مزہ ابھی تک نہیں بھُولا تھا مگر اب وہ عوام اور خاک نشیں صُوفیوں کی صُحبت سے نکل کر بادشاہوں کے دربار اور امیروں کی محفل میں باریاب ہونے لگی تھی۔ اہلِ دولت کی تہذیب کے تقاضے ہی کچھ اور تھے۔ اُن کو لُبھانے کے لیے شیرینی اور سادگی کافی نہیں تھی بلکہ زبان کو اُن کے حضور میں بڑی شان و شوکت سے اور بہت بن سنور کر جانا پڑتا تھا۔ اُردو کو آرائش و زیبائش کا یہ سارا سامان فارسی کے توشے خانوں سے مُفت مل گیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنا پُرانا چولا اُتار پھینکا اور فارسی کا جامہ پہن لیا۔ نغمہ ہندی رہا مگر لے ایرانی ہو گئی۔

لیکن دکنی شاعر عشق کا اظہار ابھی تک عورت کی زبان سے کرتا تھا۔ محبُوب کو سجن، پیا اور پیُو پکارتا تھا، اس کے جسم کو چندر بدن اور سُورج مُکھی سے تشبیہہ دیتا تھا اور سکھی سے دل کا درد بیان کرتا تھا البتہ قیس، مجنُوں اور فرہاد کے تذکرے بھی شروع ہو گئے اور شیریں و لیلیٰ کی تلمیحیں بھی رواج پانے لگیں۔ مثنوی کی صنف بہت مقبُول ہوئی۔ چنانچہ ہندی قصّوں کے علاوہ فارسی قصّے بھی نظم کیے جانے لگے (پھُول بن، قطب مُشتری، لیلیٰ مجنوں اور ماہ پیکر وغیرہ)۔ فارسی بحریں تو بہمنی دور ہی میں اختیار کی جا چکی تھیں۔ قُطب شاہی دَور میں ایک نیا تجربہ کیا گیا کہ فارسی شُعراء کی زمین میں غزلیں کہی جانے لگیں۔ بلکہ بعض اوقات فارسی غزلوں کا لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً محمّد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء-۱۶۱۱ء) نے جو اُردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر ہے۔ حافظ کی مشہور غزل "یُوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور" کا ترجمہ ان لفظوں میں کیا ؎

یُوسف گم سو پھر آ گا اب بہ کنعاں غم نہ کھا — گھر ترا اُمید کا ہو گا گلستاں غم نہ کھا

دکن کے باغوں میں ابھی تک چنپا کلی کی مہک باقی تھی اور تالابوں میں کنول کے پھُول کھِلتے تھے مگر سوسن، نرگس اور گلاب کے بُوٹے بھی بہاریں دکھانے لگے۔ پاؤں میں گھنگرو باندھ کر ساجن کے ساتھ بسنت کھیلی جاتی تھی مگر عید اور نوروز کے جشنوں کے آگے عبیر اور گلال کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ رُجحان اتنا بڑھا کہ اُردو زبان جس پر اب تک ہندی کی چھاپ تھی، فارسی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئی۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ قطب شاہی دَور سے پہلے اُردو شمال میں ہو یا جنوب میں، فقط بول چال کی زبان تھی۔ جسے صُوفیوں اور سنتوں فقیروں نے اپنے خیالات عوام تک پہنچانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس پر شہری تہذیب کا روغن نہیں چڑھا تھا۔ شہری تہذیب سے یہ زبان پہلی بار دکن میں آشنا ہوئی۔ اُس کا اُفق وسیع ہُوا۔ اُس کی لُغت اور علامتوں میں اضافہ ہُوا۔ اُس میں رزم و بزم کی منظر کشی، واقعہ نگاری، مُرقّع کشی اور جذبات نگاری کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ وہ سچ مچ ایک مُہذّب اور ترقی یافتہ زبان بن گئی۔

دکنی دَور کی اُردو میں گجراتی، مرہٹی اور پنجابی کے الفاظ بکثرت ملتے ہیں جو بعد میں متروک ہو گئے۔ یہاں ہم فقط چند ضمائر اور حروف مثال کے طور پر نقل کرتے ہیں:

ہور — اور	دستے — نظر آتے	ہمنا۔ ہمن — ہم کو	جکوئی — جو کوئی
سوں — سے	پات — پتہ	یو — یہ	مُنج — مجھ
اجوں لگ — ابھی تک	بہار — باہر	کوں — کو	اَتھا — تھا
رُخن — طرف	اس پو — اس پر	کدھن — کس سمت	نال — ساتھ
کاں — کہاں	تمن — تم کو	کنے — پاس	

دکنی اُردو کی مندرجہ ذیل صرفی و نحوی خصوصیات کا ذکر مولوی عبدُالحق نے سب رس مُصنفہ مُلّا وجہی کے مُقدمے میں کیا ہے:

۱۔ مذکر اور مؤنث دونوں کی جمع پنجابی کے مانند "آں" سے آتی تھی جیسے جھاڑاں۔ باتاں۔ کتاباں۔

۲۔ متعدی افعال جن کے پہلے "نے" آتا تھا وہ ہمیشہ مؤنث بولے جاتے تھے جیسے لڑکی نے پانی پی۔

۳۔ فاعل اگر جمع مؤنث ہوتا تو فعل میں بھی "آں" کا اضافہ کر کے جمع بنائی جاتی جیسے عورتاں جاتیاں ہیں۔

۴۔ مؤنث کی صُورت میں حرفِ اضافت کی بھی جمعیں آتی تھیں جیسے دل کے تائے کیاں بہت باتاں ہیں۔

۵۔ اسی طرح ایسی، جیسی، جتنی کی جمع ایسیاں، جیسیاں، جتنیاں۔
۶۔ ایسے مصادر جن میں علامت مصدر سے پہلے "ا" یا "د" ہو پنجابی کی مانند ان کی ماضی مطلق "یا" سے بناتے تھے جیسے دیکھیا، لیا، پھریا
۷۔ پنجابی کی مانند مستقبل کی علامت "سی" تھی۔
۸۔ ضمائر بھی پنجابی سے مشابہ تھے جیسے اُنو (انھوں نے) اُنکو (اُن کو) جنو (جنھوں نے) ہمنا۔
۹۔ الفاظ کے آخر میں "چ" تاکیدی حرف ہوتا تھا جس کے معنی عموماً "ہی" کے ہوتے ہیں۔
۱۰۔ مانگنا بمعنی چاہنا مستعمل تھا
۱۱۔ اکثر عربی الفاظ کو جیسے بولتے تھے اسی طرح لکھتے تھے جیسے نفع کو نفا۔ واقعہ کو واقا۔ منع کو منا۔
۱۲۔ جس لفظ میں دو "ڈ" یا ایک "ڈ" اور "ٹ" ہو اس میں "ڈ" کو "د" سے بدل دیتے تھے جیسے ڈھونڈھ کو دھونڈھ، ڈانٹ کو دانٹ۔
۱۳۔ مکرّر الفاظ کے درمیان "ے" بڑھا دیتے تھے جیسے گھرے گھر۔ ٹھارے ٹھار۔

شاید یہ کہنا درست نہ ہو کہ دلّی اور دکن کی خود مختار ریاستوں کے درمیان کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہا تھا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ ڈھائی سو سال کی مدت میں دکنی اردو اور شمالی ہندوستان کی اردو نے ایک دوسرے کا اثر قبول نہیں کیا اور دونوں خطّوں کی زبانیں الگ الگ راستوں پر چلتی رہیں۔ البتہ ۱۶۳۶ء میں جب شاہ جہان کے عہد میں اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار بنا تو دونوں زبانوں کا ملاپ اورنگ آباد (کھرکی) کے مقام پر ہوا کہ مغلیہ شہزادے کا مستقر تھا۔ یہ شہر دولت آباد سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اُسے دکن کا دروازہ خیال کیا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے اپنی زندگی کے چالیس سال دکن میں گزارے۔ چودہ سال صوبیدار کی حیثیت سے اور عمر کے آخری ۲۶ سال دکنی مہموں کے سلسلے میں۔ وہ بڑا عالم، علم نواز اور صاحبِ قلم تھا۔ دکن کی ریاستوں پر زوال آچکا تھا اور سلطنتِ مغلیہ کا آفتاب عروج پر تھا۔ چنانچہ دکن کے اُمرا، فضلا اور شعرا نے اورنگ آباد کا رُخ کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ شہر علم و ادب کا نہایت اہم مرکز بن گیا۔ اورنگ زیب نے بیجاپور (۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) کو فتح کیا تو اورنگ آباد کی رونق اور بڑھ گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر محی الدین زور دکن کی ادبی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ :

"اورنگ زیب نے بیجاپور اور حیدر آباد کو تو اُجاڑ دیا اور وہاں کی ادبی محفلیں اور بازار اردو کی چہل پہل سُونی ہوگئی لیکن اس کی وجہ سے اورنگ آباد شعر و ادب، علم و فن اور تہذیب و تمدّن کا ایک ایسا مرکز بن گیا جو اس کی وفات کے بعد بھی تقریباً ایک صدی تک درخشاں رہا۔ اس وقت اورنگ آباد پورے ہندستان کا دل تھا اور ہر صوبے کے امیر، فقیر، سپاہی اور ادیب شاہی دربار سے فیض یاب ہونے کے لیے وہاں آتے تھے۔ خود حیدر آباد اور بیجاپور کے متعدد باقی ماندہ شعرا اور صاحبانِ کمال بھی وہیں کھنچے چلے گئے تھے۔" (ص ۱۲۹)

اُردو کا اورنگ آبادی دَور دراصل ایک درمیانی کڑی ہے جو دکن کو شمالی ہندستان سے ملاتی ہے۔ اورنگ آباد کے لوگوں کی زبان میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے جو دکنی تہذیب سے بھی متاثر ہے اور اردوئے معلّیٰ سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ بلکہ اورنگ آباد کے قدیم شعرا اپنے آپ کو دکن کے مقابلے میں دہلی سے زیادہ قریب پاتے تھے۔ ان دونوں علاقوں میں آمد و رفت کا سلسلہ بھی مدت سے تھا کیونکہ اورنگ آباد اور گجرات اکبر کے زمانے ہی میں فتح ہو چکے تھے اور اُن کا رُخ دکن کی بجائے دہلی کی طرف تھا۔

اورنگ زیب کے عہد میں کئی دکنی شاعر ایسے تھے جن کا تعلق اورنگ آباد سے تھا۔ ان میں قاضی محمود بحری (مثنوی من لگن)، شیخ داؤد (صفیفی) وجدی اور ولی زیادہ مشہور ہیں۔ ولی نے اورنگ زیب کے عہد میں دہلی کا سفر بھی کیا تھا۔ مگر ولی سے پہلے ہم خود دہلی کا سفر کریں گے تاکہ عہدِ مغلیہ میں اردو کے ارتقا کا جائزہ لے سکیں۔

ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں کہ سُوری اور لودھی فرماں رواؤں کے عہد میں اردو کو بہت فروغ ہوا کیونکہ یہ بادشاہ ہندستان ہی کے باشندے تھے۔ یہیں کی بولی بولتے تھے اور فارسی سے انھیں خاص لگاؤ نہیں تھا۔ ان کے برعکس سلطنتِ مغلیہ کا بانی بابر ترک نژاد تھا۔ اس زمانے میں فارسی تہذیب اور زبان پورے وسطی ایشیا پر حاوی تھی جس طرح فرانسیسی کچھ عرصے پہلے تک یورپی تہذیب کی زبان تھی۔ چنانچہ مغلوں میں بھی فارسی تہذیب رچی ہوئی تھی۔ ہمایوں نے جلاوطنی کے بارہ سال ایران میں بسر کیے تھے اور جب وہ دہلی واپس آیا تو اُس کے جلو میں ایرانی امیروں اور لشکریوں کا ایک جمِّ غفیر تھا۔ اکبر کی ماں ایرانی تھی اور اُس کی پرورش بھی ایرانی ماحول میں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلاطینِ مغلیہ کے عہد میں فارسی زبان کو شمالی ہند میں بڑا عروج حاصل ہوا۔ چنانچہ اکبر نے اپنے وزیرِ مال راجہ ٹوڈرمل کو ہدایت کی کہ آئندہ سے دفتری کاروبار ہندی کے بجائے فارسی میں ہوا کرے۔ لہٰذا ایک فرمان جاری ہوا جس کی رُو سے امورِ مملکت میں ہندی کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا۔ اس فرمان کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ سولھویں صدی میں اردو رفتہ رفتہ فارسی پر غالب آتی جاتی تھی اور اگر سرکاری دربار میں اس کا داخلہ یُوں فرمان کے ذریعہ بند نہ کیا جاتا تو اردو کو وہ رُتبہ مل جاتا جس کی وہ مستحق تھی۔ اس سرکاری پابندی کے باوجود عوام میں اردو کی مقبولیت بدستور باقی رہی۔

تذکرہ نویسوں نے اکبر اور جہانگیر کے عہد کے متعدد ہندو اور مسلمان شاعروں کا ذکر کیا ہے جو ہندی میں شعر کہتے تھے۔ تلسی داس مصنف رامائن (۱۵۳۲ء۔۱۶۲۳ء)، سورداس، گنگ، برہم، سعدی کاکوروی، پنڈت چندربھان، مولانا افضل جھنجھانوی (وفات ۱۶۰۹ء) مصنف بارہ ماسہ، شیخ عثمان غازی پوری مصنف چتراولی، رحیم (عبدالرحیم خان خاناں)، نرہری اور ہاتا کوی (جو اکبری دربار سے وابستہ تھے) کیشو مسر اور پوکھر (جو دربار جہانگیری سے تعلق رکھتے تھے)، شیخ عثمان جالندھری (مجدد الف ثانی کے پیر بھائی) وغیرہ اسی دور کے بزرگ ہیں۔ مورخوں نے تو بابر اور اکبر سے بھی چند ہندی اشعار منسوب کیے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمایوں کا بھائی دانیال بھی ہندی میں شعر کہتا تھا۔ اگر ان غیر معتبر باتوں کو درست مان لیا جائے تو بھی اکبری عہد کی زبان اور شاعری خسرو اور کبیر کے عہد سے چنداں مختلف نہیں تھی۔ یوں بھی تلسی داس جیسے شاعروں کی تصنیفات کو اردو کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس دور میں بول چال میں تو وہی ملی جلی زبان استعمال ہوتی تھی جسے ہم اردو کہتے ہیں۔ البتہ ادبی تحریروں میں خالص فارسی کا رواج تھا یا ٹھیٹ

ہندی کا۔ لیکن اس عہد کی ایک خصوصیت ایسی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بول چال کی زبان کا جوڑ فارسی ادب سے ملا کر اُردو کو ایک نئی شکل دینے کی کوششیں جاری تھیں۔ وہ خصوصیت ہے ہندی یا فارسی کی بحروں میں ایسے اشعار کہنا جن کی بندش آدھی فارسی تھی اور آدھی ہندی۔ دکن میں اس طرزِ سخن کا رواج نہیں ہُوا بلکہ یہ خالص شمالی تجربہ ہے۔ مثلاً افضل جھنجھانوی لکھتے ہیں ؎

چہ سازم ، چُوں کنم کس کن پکاروں — جتن کیا عشق کے غم کا بچاروں
جنوں در ملک جاں جھنڈا گڑایا — سمجھ ور بُوجھ کا تھانا اُٹھایا
چو شد مُدّت پیا کے سنگ رہتے — مرم بایک دگر کہتے و سُنتے
چہ می بینم کہ منگل گاوتی ہیں — مرے گھر ناریاں سب آوتی ہیں

یا شیخ عثمان جالندھری کہتے ہیں ؎ عاشق دیوانہ ام آؤ پیارے حبیب — از ہمہ بیگانہ ام آؤ پیارے حبیب

یا ؎ منم مُشتاق دیدارت اری ٹک دُور کُن گھونگٹ — بجان و دِل خریدارت اری ٹک دُور کُن گھونگھٹ

منشی ولی رام (وفات ۱۶۵۰ء) دارا شکوہ کا مشیرِ خاص تھا اس سے بھی اسی قسم کی ایک غزل منسوب ہے جس کا مطلع یہ ہے ؎

چہ دل داری دریں دنیا کہ دُنیا سے چلا نا ہے — چہ دل بندی دریں عالم کہ سر پر چھوڑ جانا ہے

خالق باری کی زبان اور اندازِ بیان بھی یہی ہے۔ غالباً یہ بھی اسی زمانے کی تصنیف ہے۔

اُردو زبان کی تاریخ میں شاہ جہاں کا عہد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اب مُغلوں اور ایرانیوں کو اس ملک میں رہتے ایک صدی سے زیادہ مدّت گزر چکی تھی چنانچہ وہ بھی فارسی آمیز اُردو بولنے لگے تھے، اگرچہ اس زبان میں شعر و شاعری کرنا یا کچھ لکھنا وہ ہنُوز اپنے لیے عار سمجھتے تھے۔ دوئمش شاہ جہان نے دہلی کو اپنا دارُالسلطنت قرار دیا۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں اس شہر کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی تھی۔ کیونکہ اکبر نے اپنا دارُالسلطنت آگرہ (فتح پور سیکری) میں مُنتقل کر لیا تھا اور جہانگیر کا زیادہ وقت آگرہ اور لاہور میں گذرتا تھا۔ البتّہ شاہجہان نے جب دہلی میں لال قلعہ تعمیر کیا اور ۱۶۳۸ء میں خود بھی وہاں مُنتقل ہو گیا تو دہلی کی قسمت دفعتاً جاگ اُٹھی۔ عمائدینِ سلطنت، اُمرا، اہلِ علم و فضل، سرکاری ملازمین، اہلِ حرفہ اور لشکری سبھی دہلی میں آ آکر آباد ہونے لگے۔ شاہی دربار سے وابستہ ہونے کے باعث ان لوگوں کو بہت شائستہ اور مُہذّب خیال کیا جاتا تھا۔ ان کی زبان زیادہ معتبر اور مُستند سمجھی جاتی تھی اور پڑھے لکھے لوگ ان کی بول چال کو معیار مان کر اُن کی تقلید کرتے تھے۔ یہ لوگ قلعے کے گرد و نواح میں بسے تھے چنانچہ ان کی بستی کو جس میں قلعہ بھی شامل تھا شاہجہان آباد کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے یہاں کی زبان کو اُردوئے معلّیٰ شاہجہان آباد دہلی کا لقب دیا ہے۔

دہلی میں اندرونِ شہر کے لوگ ایک مخلوط قسم کی زبان بولتے تھے جس کو بانگڑو کہتے ہیں۔ اس میں ہریانی (ہانسی، حصار، کرنال وغیرہ کی بولی) اور پنجابی کے لفظوں اور محاوروں کی خاصی آمیزش تھی (دیباچہ نوادرُالالفاظ از ڈاکٹر سیّد عبدُاللہ) اُردوئے مُعلّیٰ اور اندرونِ شہر کی بولی کے فرق کو سیّد انشا نے اپنی کتاب دریائے لطافت (۱۸۰۸ء) میں بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ دہلی چونکہ سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اس لیے آس پاس کے علاقوں کے لوگ تجارت، ملازمت اور روزی روزگار کے سلسلے میں دہلی آتے اور پھر وہیں کے ہو رہتے۔ ان میں پنجابی اور کشمیری بھی تھے، مُغل اور حصار والے بھی اور برج باسی اور پوربی بھی۔ دہلی میں ان کی بستیاں بن گئی تھیں۔ چنانچہ سیّد انشا نے ان بستیوں کی زبان کی خصوصیات بتائی ہیں۔ پھر ان کا موازنہ اُردوئے مُعلّیٰ سے کیا ہے۔ مثلاً چُنیامل دلال کی زبان پر پنجابی کی چھاپ تھی۔ کیونکہ وہ "پنجابی الاصل" تھا۔ کشمیریوں میں "جن کو شاہجہان آباد کے فصیح لوگوں کی صحبت نصیب نہیں ہوئی" نُونِ غُنّہ کے اعلان کا بہت رواج تھا اور وہ مُضاف مُضاف الیہ میں "کو" بڑھا دیتے تھے۔ مذکّر کی جگہ یائے مجہول اور مؤنّث کی جگہ یائے معرُوف بولتے تھے۔ فعل ماضی کی جگہ مصدر بولتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ انشا نے بارہہ کے سیّدوں (جو برج کے رہنے والے تھے) مغل پُورہ والوں اور پوربیوں کی بولیوں کا فرق بھی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ انشا نے مختلف گروہوں کے لب و لہجے کی بھی تحقیق کی ہے اور اُردوئے مُعلّیٰ سے اُن کا موازنہ کیا ہے۔

سیّد انشا کے آباؤ اجداد دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُنھوں نے دہلی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اٹھارویں صدی کا ہے یعنی شاہ عالم کے زمانے کا مگر آبادی کی تقسیم کا یہ نقشہ سترھویں صدی سے چنداں مُختلف نہیں۔ اُنھوں نے اپنی کتاب میں اُن محلّوں کی نشان دہی کر دی ہے جہاں کی زبان کو وہ مُستند اور قابلِ تقلید سمجھتے تھے۔ لال قلعے کو سب پر فضیلت حاصل تھی۔ کیونکہ بادشاہ اور شاہی خاندان کے افراد وہیں رہتے تھے۔ وہاں سے "ملکہ آفاق کی حویلی تک فصاحت در و دیوار سے برستی ہے اور بہ جتلی قبر سے ترکمان دروازے تک ایک طرف اور دہلی دروازے تک دُوسری طرف اور پھر چوک سعدُاللہ خاں تک اور نواب امیر خاں کا بازار اور حویلی اور تیراہہ بیرم خاں اور محلّہ فولاد خاں اور کوچہ چیلاں جو دہلی دروازے کا ایک حصّہ ہے" (ص ۳۷) دہلی کی ٹکسالی زبان کے حدُود اربعہ یہی تھے۔ میرؔ اور داغؔ اسی خطّے کی زبان کو مُستند مانتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ اُردوئے مُعلّیٰ یا دہلوی زبان سے مُراد دہلی کے اسی علاقے کی زبان تھی اور دُوسرے شہروں کے ادیب اور دانش ور اسی زبان کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اُردو زبان نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جو ترقّی کی اس کا اندازہ درسی کتابوں، لُغتوں اور شاعروں کے کلام سے ہوتا ہے ہم لکھ آئے ہیں کہ اورنگ زیب کی عمر کے آخری ۲۶ سال دکن میں گزرے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ سے دہلی اور دکن میں آمد و رفت کا سلسلہ بڑھا ہو گا اور شعرا اور اہلِ علم حضرات بھی دہلی سے دکن اور دکن سے دہلی آتے جاتے ہوں گے۔ بالخصُوص دکنی ادیبوں کی اُردو تخلیقات سے دہلی والے ضرور مُتعارف ہُوئے ہوں گے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں اُردو کی تعلیم کا باقاعدہ رواج ہو چلا تھا اور نصابی کتابیں بھی تصنیف ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ پروفیسر شیرانی کی تحقیق کے مُطابق خالق باری اور صمد باری وغیرہ اس زمانے کی درسی کتابیں ہی تھیں۔ ان کتابوں میں فارسی اور عربی الفاظ کے ہندی مُترادفات نظم کیے گیے ہیں۔ یہ طریقۂ تعلیم خود اس بات کا ثبوت ہے کہ فارسی کے مقابلے میں اُردو کا پلّہ بھر بھاری ہو رہا تھا اور لوگوں کو اُردو زبان سیکھنے کی ضرورت

مخصوص ہونے لگی تھی۔ اورنگ زیب ہی کے عہد میں مولوی عبدالواسع ہانسوی نے اُردو کا پہلا لغت "غرائبُ اللغات" مرتب کیا۔ اس سے پیشتر خلجی اور لودھی فرماں رواؤں کے عہد میں یا اس کے بعد فارسی کی جو لغتیں ہندستانی مصنفین نے مرتب کیں، گو ان میں فارسی الفاظ کی شرح کرتے ہوئے ہندی مرادفات بھی دیے جاتے تھے (جس سے ہندی کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے) لیکن غرائبُ اللغات پہلی لغت ہے جس میں اُردو الفاظ کی تشریح فارسی میں کی گئی ہے۔ غرائبُ اللغات اُردو کے لسانی ارتقا کے سلسلے میں نہایت اہم دستاویز ہے۔ اس سے اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا پتا چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں دہلی اور مضافات میں کس قسم کی زبان بولی جاتی تھی اور الفاظ کا املا اور تلفظ کیا تھا۔ غرائبُ اللغات کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اُردو الفاظ ہریانی تلفظ اور لہجے کے تابع ہیں۔ کیونکہ اُس زمانے میں اس علاقے پر ہریانی بولی کا غلبہ تھا۔ مولوی عبدالواسع قدما کی تقلید کرتے ہوئے فارسی اور عربی لفظوں کا وہی املا اور تلفظ کرتے ہیں جو عام طور پر رائج تھا۔ مثلاً انھوں نے چرخی کو چرکھی، رقیت کو رکیت، زچہ کو جچا، آفتابہ کو آفتاوا، رحل کو رحیل اور پزاوا کو پجاوہ لکھا ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں شمالی ہندستان کی اُردو زبان کا اندازہ جعفر زٹلی، ناصر علی سرہندی، سید اٹل نارنولی، مولانا عبدی، شیخ محمد فاضل بٹالوی اور شیخ محمد نوز کے کلام سے بھی ہوتا ہے۔ ان شاعروں میں جعفر زٹلی کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ وہ مدتوں دکن میں بھی رہے ہیں۔ جعفر زٹلی ۱۶۵۶ء میں نارنول میں پیدا ہوئے۔ تلاش معاش کے سلسلے میں دہلی گئے اور شہزادہ کام بخش کی فوج میں ملازم ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد جب شہزادہ کو دکن جانا پڑا تو جعفر زٹلی بھی اس کے ہمراہ گئے۔ فرخ سیر کے عہد میں قتل کر دیے گئے۔

جعفر زٹلی نے زیادہ تر مزاحیہ اشعار لکھے ہیں جن کا مقصد غالباً شہزادوں اور امیروں کو ہنسانا تھا مگر ان کے کلام میں سنجیدہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے ان کے اشعار کا جو نمونہ دیا ہے اِس سے پتہ چلتا ہے کہ جعفر زٹلی نظمیں غزل کے پیرائے میں لکھتے تھے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

نہ سو سُکھ سیج راحت میں سدا رہ زہد و طاعت میں　　اجل بھی ہے گی ساعت میں کہ آخر خاک ہو جانا
جنھوں کے لاکھ تھے گھوڑے، سدا زربفت کے جوڑے　　اُنھوں کو موت نے توڑے کہ آخر خاک ہو جانا

ناصر علی سرہندی غزلیں کہتے تھے۔ چند شعر آپ بھی سُنیئے ؎

بُتِ جُوں کے ساغرِ حُسن کے بھیتر اُچھوں لباب سوں بل پڑے گا　　ہووے گی نرگس خجل چمن موں، گلوں کی انکھیاں پہ گل پڑے گا
علی ملاحت ترے سجن کی اگر زلیخا سُنے گی کہوں　　مصر میں سودا دِگر ہووے گا، دِرم نہ یُوسف کا مُل پڑے گا

مولانا عبدی پر پنجابی کا اثر زیادہ ہے۔ چنانچہ اُن کی فقہِ ہندی کی بحر بھی پنجابی ہے ؎

حمد ثنا سب رب کوں خالق کُل جہان　　لائق حمد ثنا کے اور نہ کوئی جان
علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسُول　　جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبُول

یہاں خاص طور سے اُن شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے جو ولی کے سفر دہلی سے پہلے کے شاعر ہیں۔ یہ لوگ نہ ولی سے ملے اور نہ ولی کی زبان سے متاثر ہوئے وہ شاید عمر میں بھی ولی سے بڑے تھے۔ اُن کے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی کے دہلی جانے سے پیشتر بھی شمالی ہند میں اُردو شاعری کا چرچا تھا اور لوگ نظمیں اور غزلیں لکھتے تھے۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ ہنوز فارسی شاعری کو اُردو پر ترجیح دی جاتی تھی اور اُردو میں فقط مُنھ کا مزا بدلنے کے لیے تفریحاً شعر کہے جاتے تھے۔

ولی ۱۱۱۲ھ/۱۷۰۰ء میں دہلی گئے تھے۔ وہاں اُن کے ممدوح محمد یار خان صوبیدار تھے۔ اُس وقت دہلی میں فائز دہلوی، سراج الدین خاں آرزو (۱۶۸۹-۱۷۵۶ء) مضمون اکبر آبادی (۱۷۴۵ء) نواب امیر خاں انجام (وفات ۱۷۴۶ء) شاہ مُبارک آبرو (وفات ۱۷۵۰ء) اور ناجی وغیرہ مشہور شعرا موجود تھے۔ مولوی محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ آبرو اور مضمون عمر میں آرزو سے بڑے تھے۔ ولی کے قیامِ دہلی کے وقت آرزو کی عمر اٹھارہ برس تھی لہٰذا آبرو اور مضمون کی عمریں زیادہ ہی ہوں گی۔ فائز تو یقیناً کُہنہ مشق شاعر ہوں گے کیونکہ اُن کا اُردو دیوان ۱۷۱۵ء میں مُرتب ہُوا۔ چنانچہ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں کہ

"حاتم، مظہر جانِ جاناں، آبرو، ناجی اور فغاں وہ شعرائے دہلی ہیں جنھوں نے ولی کا کلام خود اُن کی زبان سے سُنا اور اُن کی غزلوں پر غزلیں لکھیں (ص ۱۲۱) اِن کھُلی شہادتوں کے باوجود یہ کہنا کہ ولی کے دہلی جانے پر وہاں "غزل گوئی فوراً شروع ہو گئی" (دیباچہ کُلیات ولی از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی) تاریخی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ ناصر علی سرہندی کا ذکر تو خود ولی کرتا ہے ؎

پڑے سُن کر اُچھل جیوں مصرعہ برق　　اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی سرہندی نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ ؎

بہ اعجازِ سخن گر اُوڑ چلے توں　　نہ پہونچے گا ولی ہرگز علی کوں (کُلیاتِ ولی ص۲۸ و آبِ حیات)

بہر حال ولی کا کلام سُن کر دہلی والوں کی آنکھیں کھُل گئی ہوں گی۔ اُس کے اشعار میں بڑی مٹھاس، گھُلاوٹ اور رس ہے۔ وہ اپنے جذبات اور تجربات کو بڑے سادہ اور دل نشین انداز میں بیان کر دیتا ہے۔ دہلی والے ان چیزوں سے محروم تھے کیونکہ ان کی زبان پر فارسی کا غلبہ تھا۔ ولی کے کلام نے شاید پہلی بار اُنھیں اُردو زبان کے محاسن اور امکانات کا احساس دلایا۔ پھر دہلی والوں کے لیے (جو دکنی زبان کو حقیر سمجھتے تھے) ولی کی زبان بھی نامانوس نہ تھی کیونکہ ولی خالص دکنی نہ تھا بلکہ گجرات یا اورنگ آباد کا رہنے والا تھا اور اُس کی زبان دکن کے بنسبت دہلی سے زیادہ قریب تھی۔ دہلی کے شاعر ولی کے کلام سے بے حد متاثر ہوئے اور اُنھوں نے ولی کی تقلید شروع کر دی۔ مگر اثر قبول کرنے کا یہ عمل یک طرفہ نہیں تھا۔ دہلی والوں نے اگر ولی سے سادہ اور بول چال کی زبان میں شعر کہنا سیکھا تو ولی نے اُن سے فارسی کی پُرشوکت ترکیبوں اور محاوروں کو اُردو اشعار میں کھپانے کا انداز حاصل کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر زور فرماتے ہیں کہ:

"ولی کے دیوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر دہلی سے پہلے اور بعد کے کلام میں زبان کا کافی فرق ہو گیا تھا۔ سفر دہلی سے پہلے کا کلام

قدیم اساتذۂ دکن کے ہم رنگ ہے اور دہلی سے واپسی کے بعد کے کلام میں فارسی اضافتیں اور ترکیبیں زیادہ دخیل ہوگئی ہیں۔" (ایضاً ص۱۳۵)
دلی کے کلام کی بعض لسانی خصوصیات قابلِ ذکر ہیں :-

۱- ولی فارسی محاوروں اور ترکیبوں کا اُردو ترجمہ بڑی خوبی سے کرتا ہے مثلاً دل خُون ہونا، باغ باغ ہونا، رُخ مالا کرنا، آب آب ہونا۔
۲- فارسی کے محاورے اور ترکیبیں کثرت سے استعمال کرتا ہے۔
۳- فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ ہندی کی علامتِ جمع لاتا ہے مثلاً غمزاں، فوجاں، وحشیاں، عالماں وغیرہ۔ وہ وضع کی جمع وضعاں بنانے سے بھی احتراز نہیں کرتا۔
۴- فارسی اور ہندی الفاظ کے درمیان اضافت کو جائز خیال کرتا ہے مثلاً اشکِ نین، سیلِ انجھواں (آنسوؤں کا سیلاب)، روزِ نہان (نہانے کا دن)، وعدۂ کل وغیرہ۔ اس طرح اس کے کلام میں شیریں بچن، خوش باس، خوش بچن کی ترکیبیں بھی ملتی ہیں۔
۵- قدما کی مانند ولی کی چند غزلوں میں عشق کا اظہار عورت کی طرف سے ہُوا ہے۔ اس کے برعکس ایک دو غزلوں میں عشق کا اظہار مرد کی طرف سے بھی ہُوا ہے اور مخاطب عورت ہے لیکن غالب اکثریت اُن غزلوں کی ہے جن میں فارسی کی تقلید میں عاشق اور معشوق دونوں مرد ہیں۔
۶- اُس عہد کی فارسی کی مانند ولی کے کلام میں رعایتِ لفظی اور ایہام کی بڑی فراوانی ہے۔

اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ملک میں جو بدامنی اور اتھل پتھل شروع ہوئی اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے بادشاہوں کا آئے دن قتل ہونا، مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث صُوبوں کا خود مختار ہونا، مرہٹوں کی یورش، ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیاں، نادر شاہ اور احمد شاہ کے ہاتھوں دلی کی بربادی غرض حادثوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اٹھارویں صدی میں اس ملک کو پیش آئے۔ مگر اتّفاق سے معاشرے کا یہی عہدِ انحطاط اُردو زبان و ادب کے فروغ کا عہد ہے۔ اُس زمانے میں لوگوں کے ایک جگہ سے بھاگ کر دُوسری جگہ پناہ لینے سے بالخصُوص دلی کے امیروں، ادیبوں اور دانش وروں کے دُوسرے شہروں میں جا کر آباد ہونے سے دہلوی زبان دُور دُور تک پھیل گئی۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں جن اہلِ علم حضرات نے اُردو زبان کو مانجھا، چمکایا اور صیقل کیا اُن میں انجام، آرزو اور شاہ حاتم بہت ممتاز ہیں۔ انجام بڑے بذلہ سنج اور صاحبِ ذوق امیر تھے۔ وہ محمد شاہی دَور میں الہ آباد کے صُوبے دار تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں کے شاعر تھے۔ ڈاکٹر شجاعت سندیلوی لکھتے ہیں کہ انجام نے اُردو زبان کی اصلاح اور ترقی کے لیے ایک انجمن قائم کی تھی جس میں الفاظ و محاورات پر بحث ہوتی اور بحث و مباحثے کے بعد جن پر سب کا اتفاق ہوتا وہ انجمن کے دفتر میں درج کر لیے جاتے اور پھر سارے ہندستان میں اس کی نقل بھیج دی جاتی" (تعارُف تاریخِ اُردو ص۴۳) اگر یہ بیان درست ہے تو اُردو میں اصلاحِ زبان کی یہ پہلی منظم کوشش تھی اور اس سے اُردو دان لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہو گا۔

آرزو بڑے فاضل محقق تھے اور شہر میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ آزاد نے اُنھیں اُردو کا ارسطو کہا ہے۔ وہ اُردو اور فارسی کے شاعر ہونے کے علاوہ سنسکرت، ہندی، پنجابی اور عربی سے بھی بخُوبی واقف تھے۔ اُنھیں فقہ اللسان پر بھی بڑا عبُور تھا۔ چنانچہ اُردو میں لسانیات کے بانی وہی ہیں۔ اُنھوں نے اُردو زبان کی لسانی تحقیق کی بُنیاد رکھی اور اُردو فیلالوجی کے ابتدائی قواعد وضع کیے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے فارسی اور سنسکرت کی مماثلت ثابت کی اور ہند آریائی زبانوں کی لسانی وحدت کی طرف اشارہ کیا اس سلسلے میں ان کی دو تصنیفات بڑی اہمیت رکھتی ہیں : نوادرُ الالفاظ اور مثمر۔

نوادرُ الالفاظ ۱۷۵۱ء میں تصنیف ہُوئی۔ آرزو نے اس کتاب میں اُردو کے مُروجہ الفاظ کے معنی و مطالب فارسی زبان میں بیان کیے ہیں اور مولانا ہانسوی کی غرائبُ اللغات کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی ہے۔ نوادرُ الالفاظ، غرائبُ اللغات کے تقریباً نصف صدی بعد لکھی گئی اور اگر دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس عرصے میں اُردو نے کتنی ترقی کی۔ پھر بھی دہلی کی زبان پر ہنوز، ہریانی، راجستانی اور پنجابی تلفظ اور املا کا غلبہ تھا، چنانچہ مُہذب لوگ بھی جیسا کہ نوادرُ الالفاظ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے ڑ کی جگہ ڈ بولتے تھے جیسے ماڑی کو ماڈھی اور ساڑھو کو ساڈھو کہتے تھے۔ ان کے علاوہ باندر (بندر)، بجاؤنا (بجانا)، تاپ (تپ) پساری (پنساری)، منجہ (پلنگ) بولتے تھے۔ آرزو کے عہد میں دخیل الفاظ کے املا اور تلفظ کا پُرانا طریقہ ہی رائج تھا یعنی فارسی اور عربی کا جو لفظ جس طرح بولا جائے اُسی طرح لکھا جائے۔ آرزو تو اُردو میں روپیا کو روپیہ یا مالوا کو مالوہ لکھنے کو بھی غلط خیال کرتے ہیں۔

مثمر زبان کے قواعد سے مُتعلق ہے۔ اس میں آرزو نے "اُردو" کا لفظ تحسین (نو طرزِ مُرصّع) اور شاہ مُراد لاہوری (نامۂ مُراد) سے بھی پہلے زبان کے معنی میں استعمال کیا ہے (دیباچہ نوادرُ الالفاظ ص۴۹) مثمر میں آرزو نے اُردو زبان کی جو تعریف کی ہے اُس سے بھی پتا چلتا ہے کہ اُن کے عہد میں بادشاہ، شاہی خاندان کے افراد اور اُمراء دربار اُردو بولتے تھے اور اُنھیں کی زبان کو ٹکسالی خیال کیا جاتا تھا۔

شاہ حاتم نے اپنا دیوان زادہ ۱۷۵۷ء میں مرتب کیا۔ اس وقت انھیں شاعری کرتے پُورے چالیس سال ہو چکے تھے اور اُن کا ضخیم کُلّیات موجُود تھا مگر اس زمانے میں اُردو زبان کی ترقی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ حاتم کو پُرانے کلام پر نظرِ ثانی کرنی پڑی اور اُنھوں نے ایک چھوٹا سا منتخب مجموعہ دیوان زادہ کے نام سے مُرتب کیا۔ اس کے مُقدمے میں وہ لکھتے ہیں کہ پہلے کُلّیات میں در، بَر، از اور متعدد الفاظ و افعال ایسے تھے جو اب رائج نہیں۔ لہٰذا میں نے دیوان زادے سے اُنھیں خارج کر دیا ہے اور عربی و فارسی کے "قریبُ الفہم اور کثیرُ الاستعمال" الفاظ اور دہلی کے روزمرے کو جو شُرفا و فصحا بولتے ہیں قبول کر لیا ہے۔ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ میں نے ٹھیٹ ہندی الفاظ کو ترک کر کے محض روزمرہ بولے جانے والے الفاظ کو اختیار کیا ہے۔ وہ بعض پُرانے لفظوں اور ترکیبوں پر اعتراض بھی کرتے ہیں مگر رواج سے مجبُور ہیں لہٰذا:

"بندہ دریں امر بر متابعت جمہُور مجبُور است"

معلوم ہوتا ہے کہ فارسی کے اثر کے باعث اُردو کے بعض شاعر حاتم کے وقت تک فارسی افعال و حروف (از، بر، در، شنیدن وغیرہ) استعمال کرتے تھے البتہ اساتذۂ سخن اس کے خلاف تھے۔ چنانچہ حاتم نے دیوان زادہ میں شاہ مُبارک آبرو کا ایک قطعہ نقل کیا ہے جس میں آبرو لکھتے ہیں کہ

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے ریختہ میں حرف ہے

بعض باتیں جو حاتم کو کھٹکتی تھیں اُن کو سودا اور میر کے عہد تک آتے آتے جمہور نے خود ترک کر دیا پھر بھی بہ کثرت الفاظ اور ترکیبیں ان بزرگوں کے کلام میں ملتی ہیں کہ غالب اور ذوق کے زمانے میں متروک ہوئیں۔ مثلاً تئیں (تُو) رَت، ٹک، ایکوں (بعض) ٹک (تھوڑا) اور (طرف) لاگا (لگا)، ماٹی (مٹی)، کنھوں (کس سے) اند (تب) لگ (تک) قفس کا قافیہ گھس۔

سودا (۱۷۱۳ء – ۱۷۸۱ء) اور میر تقی میر (۱۷۲۴ – ۱۸۱۰ء) کے عہد میں اُردو تمام ہندستان میں پھیل گئی اور ادیب و انشا پرداز اپنی تحریروں میں دہلوی زبان کی تقلید کرنے لگے۔ دہلی میں تو خاک اُڑ رہی تھی مگر دُور مشرق میں زبان و تہذیب کے نئے نئے مرکز قائم ہو رہے تھے۔ ان میں سب سے اہم لکھنؤ تھا جہاں شاہانِ اودھ کی بدولت اُردو شعر و سخن کا بڑا چرچا تھا۔ لکھنؤ کے علاوہ حیدر آباد، پٹنہ، عظیم آباد اور کلکتہ میں بھی اُردو ہی کا سکہ چل رہا تھا۔

میر و سودا کے زمانے میں زبان اَور صاف ہوئی۔ فارسی کے محاورے کثرت سے اُردو میں اس خوبی سے ڈھالے گئے کہ آنے والی نسلوں کو اُن کا بدیسی پن محسوس بھی نہ ہُوا۔ زبان کی لُغت بہت بڑھ گئی اور سخن وروں کو اظہار بیان پر وہ قُدرت حاصل ہوئی کہ اُنھوں نے ہر صنفِ سخن — غزل، قصیدہ، مثنوی، واسوخت، ہجو — کو معراج پر پہنچا دیا اور دقیق سے دقیق مضمون کو بھی آسان زبان میں ادا کر دیا۔

ہم اُوپر لکھ آئے ہیں کہ اُردو نثر کی ابتدا چودھویں صدی کے اَواخر میں ہو چکی تھی۔ اس کے بعد دکن میں تو نثر کی متعدد تصنیفات ہوئیں لیکن شمالی ہند میں نثر نویسی کا آغاز اٹھارویں صدی میں ہُوا۔ چنانچہ نثر کی پہلی کتاب جو شمالی ہند میں لکھی گئی فضلی کی وہ مجلس یا کربل کتھا ہے (۱۷۳۱ء) سودا نے اپنے دیوان کا دیباچہ اُردو میں لکھا مگر اُردو نثر ابھی تک فارسی کی روایت سے آزاد نہیں ہوئی تھی بلکہ لوگ فارسی کی تقلید میں نہایت مصنوعی طرز کی مقفّیٰ اور مسجّع عبارت لکھتے تھے۔ البتہ قرآن شریف کے جو ترجمے اُس زمانے میں ہوئے اُن کی زبان بہت صاف اور آسان ہے۔

یہ زمانہ لکھنوی تہذیب کے عروج کا تھا اور شمالی ہندستان میں لکھنؤ کا طوطی بولتا تھا۔ دہلی کے نامی گرامی شعراء وہیں بھاگ بھاگ کر پناہ لے رہے تھے حتیٰ کہ سودا اور میر کو بھی ترکِ وطن کر کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ لہٰذا اُردو کی ٹکسال بھی اب لکھنؤ ہی میں قائم ہوئی اور اس میں شبہ نہیں کہ لکھنؤ والوں نے اُردو زبان کی بڑی خدمت کی اور اسے خوب سنوارا سجایا۔ انھیں میں ایک بزرگ شیخ امام بخش ناسخ (۱۷۷۱ء – ۱۸۳۸ء) تھے۔ وہ بڑے قادرُالکلام شاعر تھے۔ اُنھوں نے اصلاحِ زبان کا بیڑا اُٹھایا۔ چنانچہ اُردو زبان کی تاریخ میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو آرزو اور شاہ حاتم کو ایک نسل پہلے حاصل ہُوا تھا۔ ناسخ الٰہ آباد، فیض آباد، بنارس اور پٹنہ میں بھی رہ چکے تھے۔ دہلی کے شعرا سے ملنا جُلنا رہتا ہی تھا اس لیے وہ اُردو کے سبھی مرکزوں کی مُروّجہ زبان سے بخوبی واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کون کون سے الفاظ، محاورے اور ترکیبیں اب متروک ہو رہی ہیں اور اُردو زبان کا رُجحان کس طرف ہے۔

ہمارے بعض محققین، ناسخ اور دُوسرے مصلحین زبان کا ذکر یُوں کرتے ہیں گویا وہ ادیب نہیں بلکہ بادشاہِ وقت یا ہائیکورٹ کے جج تھے کہ ادھر اُن کا حکم ہُوا اُدھر لوگوں نے اپنی زبان میں اصلاح کر لی۔ یہ طرزِ فکر غیر تاریخی ہے کیونکہ زبان کی دُنیا میں کُن فیکون کا قانون نہیں چلتا۔ اور نہ کسی بادشاہ کا فرمان کام آتا ہے۔ یہاں اگر کسی کا حکم چلتا ہے تو وہ عام لوگ ہیں جو نہ کسی کے کہنے سے زبان بولتے ہیں اور نہ کسی کے کہنے سے اُسے ترک کرتے ہیں۔ ترک و قبول ایک مسلسل اور تدریجی عمل ہے جو زبان کی دُنیا میں ہر وقت جاری رہتا ہے۔ الفاظ اور محاورے جب اپنی افادیت کھو دیتے ہیں تو لوگ انھیں کھوٹے سکّے کی مانند ترک کر دیتے ہیں اور نئے الفاظ و محاورات کو جو اظہار و ابلاغ میں اُن کی مدد کریں قبول کر لیتے ہیں۔ لہٰذا آرزو یا حاتم یا ناسخ کی اہمیّت اصلاحِ زبان کے سلسلے میں یہ نہیں ہے کہ اُنھوں نے ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ فیصلہ کیا کہ کل سے فلاں ترکیبیں، الفاظ اور محاورات ترک کر دیے جائیں گے اور لوگوں نے ہنسی خوشی ان کی بات مان لی یا انھوں نے کہا فلاں الفاظ کل سے رائج ہو جانے چاہئیں اور وہ پُورے ملک میں رائج ہو گئے۔ اس کے برعکس ان مصلحین کی عظمت کا سبب یہ ہے کہ اُنھوں نے یہ معلوم کیا کہ ملک کے شائستہ لوگوں نے کن الفاظ و محاورات کا استعمال ترک کر دیا ہے اور کون کون سے نئے الفاظ و محاورات زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔

مصحفی اور انشاؔ، ناسخ سے فقط پانچ چھ سال بڑے تھے مگر ان کی زبان ناسخ کی زبان سے میل نہیں کھاتی کیونکہ مصحفی اور انشا دونوں دہلی کے تربیت یافتہ تھے۔ مصحفی کی تعلیم اور جوانی کا زمانہ دہلی میں گزرا تھا چنانچہ اُن کے کلام پر دہلوی زبان کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اور وہ ان لفظوں اور محاوروں سے بھی گریز نہیں کرتے جو لکھنؤ میں متروک ہو چکے تھے۔ مثلاً ایدھر، جھنوں کے، پوچھو ہو، کیدھر، یاراں، عاشقاں، کھولیاں، بولیاں، ہمیں جانوں ہوں نت، ٹک، زور (بہت) طرزیں، مزاریں، تس پر، ٹھور، کنے وغیرہ۔ انشا غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ اُن کی قوتِ ایجاد و اجتہاد کے باعث آزاد نے انھیں اُردو کا امیر خسرو لکھا ہے۔ وہ عربی اور فارسی کے علاوہ پنجابی، کشمیری، مرہٹی، پشتو، پوربی اور برج بھاشا سے بھی واقف تھے۔ ان کا رُجحان زیادہ ہندی کی طرف ہے۔ چنانچہ بعض اوقات اُن کے اشعار کی فضا بھی ہندوی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے نثر میں رانی کیتکی کی کہانی لکھی جس میں عربی فارسی کا ایک لفظ نہیں آنے دیا۔ لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ دریائے لطافت (۱۸۰۷ء) ہے۔ قواعدِ اردو کی یہ پہلی کتاب ہے جو کسی اہلِ زبان نے لکھی۔ اس میں انشا نے اُردو بولنے والوں کے مختلف فرقوں کی زبانوں کے نمونے دکھائے ہیں اور پھر زبان کے قواعد بیان کیے ہیں۔ اُنھوں نے عروض کے اصولوں اور اصطلاحوں کے عربی ناموں کا ہندی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

اُردو میں انگریزی لفظوں کا داخلہ بھی انشا ہی کے زمانے میں شروع ہُوا۔ یُوں تو انگریزی کا ایک آدھ لفظ میر کے کلام میں بھی مل جائے گا (روٹ بل) مگر انشا نے انگریزی الفاظ بڑی آزادی سے استعمال کیے ہیں (رفقن، فٹن) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے غلبے کے باعث شمالی ہندستان کے لوگ انگریزی اصطلاحوں سے واقف ہوتے جا رہے تھے۔

مولوی وحید الدین سلیم نے ایک مضمون میں (افاداتِ سلیم) میر تقی میر کے عہد کی زبان کی خصوصیات پر بڑا مفصل تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرے سے میر اور ناسخ کے عہد کی زبانوں کا فرق بہت واضح ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں کے عہد میں ۳۰، ۳۵ سال سے زیادہ کا فرق نہیں ہے۔ ناسخ کے زمانے میں جو الفاظ و محاورے متروک ہوئے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

۱۔ فعل کے صیغۂ جمع میں "آں" کا جو اضافہ کر دیتے تھے وہ ترک کر دیا گیا۔ مثلاً آئیاں اور لائیاں کے بجائے آئی اور لائی رہ گئے۔

۲۔ اسم کی جمع "آں" کے بجائے "وں" کے اضافے سے بننے لگی مثلاً ہمسایہ سے ہمسایوں، ہواخواہ سے ہواخواہوں نہ کہ ہواخواہاں۔

۳۔ نے، کو، پر، سے وغیرہ حروفِ معنوی ترک کردیے جاتے تھے۔ اب ان کا استعمال عام ہوگیا۔

۴۔ مضارع میں "ہے" بڑھا کر فعل حال بنا لیتے تھے جیسے پھرے ہے، رہے ہے۔ ناسخ کے زمانے میں امر میں "تا" کا اضافہ کرکے فعل حال بنانے لگے جیسے پھرتا ہے، جاتا ہے۔

۵۔ ماضی معطوفہ اور امر میں صورۃً کوئی فرق نہ تھا۔ اب امر پر "کر" بڑھا کر ماضی معطوفہ بنائی جانے لگی۔ مثلاً لگاکر، دیکھ کر۔

۶۔ مجھ اور تجھ اضافی حالت میں بھی استعمال کیے جاتے تھے۔ مثلاً مجھ پاس، تجھ گھر۔ ان کی جگہ میرا اور تیرا استعمال ہونے لگے۔

۷۔ ان مصادر سے فعل مضارع وضع کرتے وقت جن کے آخر میں "ی" "و" یا "ا" ہے ایک "و" اور بڑھا دیتے تھے جیسے ہووے، جاوے، دیوے۔ ناسخ کے وقت میں "و" کا اضافہ ترک ہوا اور ہوئے، جائے، دے، لائے وغیرہ رائج ہوئے۔

۸۔ دکنی، گجراتی، پنجابی اور برج بھاشا کے کلمات متروک ہوئے مثلاً آگو (آگے) تئیں (تو) سیں اور سی (سے) کسو (کسی) کبھو یا کدھی (کبھی) جُد (جب) تد (تب) تس پر (اس پر وغیرہ)۔

۹۔ مضاف الیہ جمع مؤنث ہوتا تو ضمیر کو بھی جمع مؤنث بولتے مثلاً باتیں ہماریاں، راتیں تمھاریاں۔ ناسخ کے زمانے میں ضمیر میں تبدیلی کا رواج ختم ہوگیا۔

۱۰۔ ناسخ کے عہد میں بہت سے لفظوں کی جنس بدل گئی مثلاً میر کے زمانے میں سیر، دید، جراحت، جان، سطح، گشت، خلش وغیرہ مذکر تھے ناسخ کے وقت سے مؤنث ہوگئے اور تغلب، خواب، گلزار، قرار، نشتر، حشر، مزار وغیرہ کو مؤنث کے بجائے مذکر بولنے لگے۔

مگر یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان کلمات کا رواج فوراً بند ہوگیا۔ الفاظ بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔ ان کو مرنے کے لیے ایک جگ چاہیئے۔ اسی طرح نئے محاورات اور کلمات بھی آہستہ آہستہ رواج پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں غالب کے عہد میں بھی آوے، جاوے اور آئے ہے، جائے ہے اور شنیدن، غلطیدن وغیرہ کا استعمال ملتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں اُردو شاعری کی زبان منجھ منجھا کر اور ترش تراش کر سڈول ہوگئی مگر زبان دانوں نے کہ بزمِ سخن آراستہ کرنے میں مصروف تھے نثر کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ دفتری زبان ہنوز فارسی تھی اور سرکار دربار کا سارا کام فارسی میں ہوتا تھا۔ نیز قدیم روایت کے مطابق اُردو نثر میں کچھ لکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ نجی خطوط اور بیاہ شادی کے رقعے بھی فارسی میں لکھے جاتے تھے۔

البتہ اُردو نثر نگاری کا باقاعدہ آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہوا۔ وہ بھی غیر ملکی حکمرانوں کی مصلحتوں کے طفیل۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اُس وقت تک قریب قریب سارے ہندستان (بہ استثناء پنجاب وسندھ) پر قابض ہوچکی تھی۔ انگریز سخت کاروباری لوگ تھے۔ انھیں نظم ونسق اور تجارت کے سلسلے میں سوداگروں، دکانداروں، کاشتکاروں، فوج کے سپاہیوں اور پیشہ ور کاریگروں سے واسطہ پڑتا تھا۔ جو درباروں کی مصنوعی اور پُرتکلف زبان کی بجائے سیدھی سادی زبان بولتے تھے۔ لہٰذا کمپنی نے انگریز ملازمین کو عام بول چال کی زبان سکھانے کا بندوبست کیا۔ اس زبان کو ہندستانی کا نام دیا گیا جو فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جاتی تھی۔ ہندستانی کا سب سے بڑا علمبردار ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھا۔ اُردو زبان پر اس کے بڑے احسانات ہیں۔ گلکرسٹ نے اُردو بڑے شوق اور محنت سے سیکھی تھی اور وہ اس زبان سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے نووارد انگریزوں کو ہندستانی کا سبق دینا شروع کیا تھا۔ اس سلسلے میں گلکرسٹ نے اُردو زبان کی قواعد تیار کی۔ آئینِ لشکری اور دوسری سرکاری دستاویزوں کا ترجمہ کیا اور ہندستانی کی ایک لغت بھی مرتب کی۔ ۱۸۰۰ء میں جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل کی کوششوں سے انگریز ملازمین کی تعلیم کے لیے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا تو ڈاکٹر گلکرسٹ ہندستانی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور ایک شعبہ ہندستانی تصنیف وتالیف کا اُن کی نگرانی میں کھولا گیا۔ اس شعبے کا کام انگریزوں کے لیے آسان درسی کتابیں تیار کرنا تھا۔ کیونکہ اُردو میں اس قسم کی کتابیں نثر میں موجود نہ تھیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے دُور دُور سے بڑے بڑے فاضل اور اہلِ زبان منشی بُلوائے۔ ان لوگوں نے تھوڑے ہی عرصے میں نثر کی ایسی بے نظیر کتابیں تصنیف کیں جن کا شمار اب تک ہمارے کلاسیکی ادب میں ہوتا ہے۔ مثلاً میر امن دہلوی کی باغ وبہار (۱۸۰۲ء) حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل (قصہ حاتم طائی ۱۸۰۲ء) میر شیر علی افسوس کی باغِ اُردو (۱۸۰۱ء) میر بہادر علی حسینی کی اخلاقِ ہندی (۱۸۰۲ء) مظہر علی ولا کی بیتال پچیسی (۱۸۰۳ء) مرزا کاظم علی جوان کی شکنتلا (۱۸۰۱ء) نہال چند لاہوری کی مذہبِ عشق (۱۸۰۳ء) اور للو لال جی کی سنگھاسن بتیسی۔ ان کتابوں کی زبان بڑی رواں، آسان، بامحاورہ اور دلکش تھی۔ عبارت آرائی، تصنع اور تکلف نام کو نہ تھا۔ اُردو نثر نویسی کی یہ ابتدائی کوششیں تھیں مگر اتنی کامیاب ثابت ہوئیں کہ ان کی وجہ سے اُردو کا سانچہ ہی بدل گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی کتابیں لوہے کے ٹائپ میں چھپتی تھیں۔ درحقیقت یہ اُردو ادب کی اوّلیں مطبوعات ہیں۔ ان سے پیشتر اُردو کی کتابیں قلمی ہوتی تھیں لہٰذا ان کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا۔ قلمی کتابیں مہنگی بھی ہوتی تھیں۔ اس لیے فقط صاحبِ ثروت لوگ ہی انھیں خرید سکتے تھے چھپی ہوئی کتابوں کا حلقہ بہت وسیع تھا کیونکہ وہ سستی ہوتی تھیں۔ چنانچہ فورٹ ولیم کالج کی مطبوعات دُور دُور تک پہنچیں اور ہزاروں آدمیوں کی نظروں سے گزریں۔ اُن کے صوری اور معنوی حسن نے اُردو داں طبقوں کو بہت متاثر کیا اور بول چال کی زبان میں انشا پردازی کا طریقہ اتنا مقبول ہوا کہ صاحبانِ قلم نے رفتہ رفتہ مقفّی اور مسجع عبارت آرائی ترک کردی اور فورٹ ولیم کالج کے انداز میں لکھنے لگے۔ غالب، سرسید، حالی اور آزاد وغیرہ نے بھی کہ جدید اُردو نثر کے بانی ہیں یہی طرزِ تحریر اختیار کیا البتہ غالب اور سرسید کی ابتدائی تحریروں میں مقفّی عبارت بھی ملتی ہے۔

اُردو زبان کی ترویج وترقی میں چھاپے خانوں اور اخباروں، رسالوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُردو کے چھاپے خانے پہلے پہل کلکتہ میں قائم ہوئے۔ اس کے بعد ایک پریس ۱۸۳۱ء میں کانپور میں اور دوسرا لکھنؤ میں ۱۸۳۷ء میں کھلا۔ رفتہ رفتہ دہلی، بمبئی، حیدرآباد دکن اور لاہور غرض ملک کے سب بڑے شہروں میں چھاپے خانے کھل گئے اور اُردو کی کتابیں کثرت سے شائع ہونے لگیں۔ اہلِ وطن نے انگریزوں سے صحافت کا فن بھی سیکھا، چنانچہ دہلی، کلکتہ، لکھنؤ اور لاہور وغیرہ سے اخبارات جاری ہوئے۔ اخباروں کی وجہ سے زبان میں ایک طرح کی یکسانیت اور ہم آہنگی آگئی اور مقامی بولیوں کا فرق کم ہوگیا۔

۱۸۳۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی کے بجائے انگریزی اور اُردو ہوگئی اور شمالی ہندستان کے باشندوں کو سات سو برس کے بعد فارسی کی حاکمیت سے نجات ملی۔ اس وقت حاکموں اور محکوموں دونوں کو یہ احساس ہُوا کہ اُردو میں تو اب تک فقط قصّہ کہانیوں کی کتابیں لکھی گئی ہیں، علمی اور فنّی تصنیفات کا خانہ بالکل خالی ہے۔ چنانچہ مغربی علوم کی کتابوں اور اصطلاحوں کے ترجموں کی ابتدا ہوئی۔ سب سے پہلے قانون کی کتابوں اور اصطلاحوں کے ترجمے کیے گئے کیونکہ عدالتوں کا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا تھا۔ اِسی زمانے میں (۱۸۴۲ء) دہلی کالج قائم ہُوا جہاں مغربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کالج کا ایک دارالترجمہ بھی تھا جس نے پندرہ سال کی مختصر مدّت میں مختلف مغربی علوم و فنون کی تقریباً ایک سو کتابیں اُردو میں شائع کیں اور مغربی اصطلاحات کو رواج دیا۔ دہلی کالج ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کی نذر ہوگیا مگر ترجمہ و تالیف کی جو روایت کالج نے قائم کی تھی وہ ختم ہونے والی چیز نہ تھی چنانچہ انگریزی کتابوں کے ترجموں کا رواج برابر بڑھتا ہی گیا۔

گذشتہ ایک صدی میں مغرب سے ربط ضبط کے باعث ہمارے ملک میں بڑی بڑی انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مغربی معیشت اور مُعاشرت کا اثر فقط ہماری اقتصادی، صنعتی اور سیاسی زندگی پر نہیں پڑا ہے بلکہ اس کی وجہ سے ہمارے رہن سہن، خوراک، پوشاک اور وضع قطع میں بھی مغربی رنگ جھلکنے لگا ہے۔ ہماری تہذیبی، جمالیاتی اور اخلاقی قدریں بھی مغربی ہوتی جاتی ہیں حتیٰ کہ ہمارے سوچنے، محسُوس کرنے اور بولنے کے انداز پر بھی مغرب کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ زبان کہ تہذیب کا عطر و علامت ہے بہت مُتاثر ہوئی ہے۔ اُردو لغت میں سینکڑوں ہزاروں الفاظ و اصطلاحات مغربی زبانوں کے داخل ہوئے ہیں۔ ہمارا پیرایۂ بیان انگریزی ہوتا جاتا ہے اور اَن گنت انگریزی ترکیبیں ترجمے کی شکل میں غیر ارادی طور پر اُردو میں رائج ہو رہی ہیں۔ بعض انگریزی دان لوگ تو بولتے اور لکھتے وقت سوچتے انگریزی میں ہیں اور پھر اُس کا ترجمہ اُردو میں کرتے ہیں۔ اور چونکہ مغرب میں آئے دن نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ علوم و فنون کی نئی نئی شاخیں پھُوٹ رہی ہیں، نئی نئی صنعتیں قائم ہو رہی ہیں، نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی ہیں۔ نئے نئے پھل، پھُول اور پودے اُگائے جا رہے ہیں، نئے نئے کام نکل رہے ہیں اور نئی نئی چیزیں پیدا ہو رہی ہیں اس لیے ان کے نام بھی لامحالہ مغربی ہیں۔ یہ چیزیں ہمارے ملک میں بھی استعمال ہوتی ہیں لہٰذا ان کے مغربی نام بھی اُردو زبان میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے اُردو لغت میں بڑا اضافہ ہُوا ہے۔